ہمارے پیارے

حسن
سخی
سید



سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی

190

نمک پارے

از

سید یحییٰ حسن

پبلشرز

سنگم کتاب گھر
اُردو بازار دہلی

ان

دوستوں کے نام

جن کی فرمائش پر

یہ

مجموعہ شائع ہو رہا ہے

بار اوّل

نومبر ۱۹۵۲ء ——— ایک ہزار ۱۰۰۰

قیمت عہ

یونین پرنٹنگ پریس دھلی

ترتیب

تقریب

لائٹ لٹریچر کے لئے مناسب نام اردو میں "ادبِ لطیف" ہو سکتا تھا مگر اس نام کو اس صنفِ ادب نے غصب کر لیا جس میں لطافت کم اور کثافت زیادہ ہوتی ہے اب آپ چاہیں تو تفریحی ادب کہہ لیجئے مگر اس سے لائٹ لٹریچر کا اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہاں لائٹ کی صفت مقصد کے لحاظ سے نہیں بلکہ طرزِ ادا کے لحاظ سے استعمال ہوتی ہے۔ مقصد خواہ تفننِ طبع ہو، خواہ درسِ حکمت، زبان صاف اور سلیس، اسلوبِ بیان دل کش اور دل آویز ہونا چاہئے۔

سید مسیح حسن صاحب کے "نمک پارے" لائٹ لٹریچر کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں چودہ مضامین ہیں جن میں سے سات مرحوم "نئی روشنی" میں اور پانچ "آج کل" اور "بیسویں صدی" میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو نئے ہیں جو ابھی تک کہیں نہیں چھپے۔

سخن حسن صاحب تیز اور باریک بیں نظر رکھتے ہیں۔ اُن میں زندگی کے اور فطرت کے گوناگوں مناظر کا تفصیل سے مشاہدہ کرنے، اُن سے لطف اُٹھانے، اور دوسروں کو اس لطف میں شریک کرنے کی صلاحیت ہے۔ جو عکسی تصویریں اُنھوں نے کھینچی ہیں اُن میں کہیں کہیں فکر و تخئیل کی وہ نزاکت بھی جھلک اُٹھتی ہے جو اوجِ کمال پر پہنچ کر ادیب کے قلم کو مصوّر کا موئے قلم بنا دیتی ہے۔ خدا اُن کو زود نویسی اور پُر نویسی سے محفوظ رکھے جس نے بہت سے ہونہار لکھنے والوں کو ڈبو دیا۔

سید عابد حسین

جامعہ نگر۔ ستمبر ۱۹۵۲ء

تمہید

بعض کتابیں پیدا ہوتے ہی مرجاتی ہیں، بعض کچھ دنوں زندہ رہتی ہیں اور جوان ہوکر مرتی ہیں، اور بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو عمرِ دوام لاتی ہیں۔ کسی کتاب کی اچھائی یا بُرائی جانچنے کا معیار میرے نزدیک اُس کا حُسنِ صورت و سیرت ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ کتنے دن زندہ رہتی ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر مجھے اتنی ہی خوشی ہے جتنی اولاد کے تمنائی کو بارہ برس میں لڑکے کی ولادت پر ہوتی ہے۔ لیکن میری یہ مسرت کامل اس وقت ہوسکتی ہے جب یہ مجموعہ خود میرے قائم کردہ معیار پر بھی پورا اُترے۔

میں نے سنہ ۳۲ء سے لکھنا شروع کر دیا تھا مگر میری ابتدائی تحریریں ٹیگور کے ترجموں پر مشتمل تھیں جو "حیات" امروہہ! اور "مسافر" مراد آباد میں چھپیں، اور "حیات" اور "مسافر" کے ساتھ عدم آباد سدھار گئیں۔ اس لئے اس مجموعے میں ان میں سے کسی کو

شامل نہیں کیا گیا۔ اس میں گولڈ اسمتھ کے "آئم ان ایسٹرن ٹیل" کا وہ ترجمہ بھی شامل نہیں کیا گیا "علیگڑھ میگزین" جیسے موقر جریدے میں شائع ہوا تھا۔ یونی ورسٹی پہنچ کر موپاساں اور چیخوف وغیرہ کو پڑھنے کا موقع ملا اور ان کے ترجمے بھی کئے لیکن چونکہ وہ کہیں شائع نہیں ہو سکے اس لئے انھیں بھی اس مجموعہ میں جگہ نہیں دی گئی۔ اس میں صرف وہ مضامین شامل کئے گئے ہیں جو پچھلے پانچ سال کی پیداوار ہیں اور "ابا جان کی کھیتی" اور "رت جگا" کو چھوڑ کر، باقی سب "نئی روشنی" "آج کل" اور "بیسویں صدی" میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۳۹ء میں ملازمت کی ابتدا ہوئی اور لکھنا ترک ہو گیا، اور اندیشہ یہ ہونے لگا کہ لکھنے لکھانے کا یہ دلچسپ شغلہ کہیں ہمیشہ کے لئے نہ چھوٹ جائے مگر اس تعطل کے دور میں بھی اس صلاحیت نے بہاؤ کا ایک دوسرا دھارا اختیار کر لیا۔ یعنی مجھے طلباء کے لئے تقریریں لکھنے اور انھیں علمی مباحثوں کے لئے تیار کرنے کا موقع ملا جن میں سے اکثر نے صوبائی مقابلوں میں اعلیٰ انعامات حاصل کئے، بہرحال لکھنے سے فرصت نہ ملی اور اس مشق نے ادبی صلاحیتوں کو بالکل مُردہ ہونے سے بچائے رکھا۔

۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے تعلق پیدا ہو گیا، اور دلی ریڈیو اسٹیشن کے تعلیمی، بچوں، اور عورتوں کے پروگراموں کے لئے میں نے لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے تخلیقی قوتیں پھر سے بیدار ہو گئیں۔ اسی اثناء میں "نئی روشنی" نکلنے لگا جس نے مجھے بڑا ابھار دیا اور پھر میں نے "نئی روشنی" کے لئے خوب خوب لکھا۔

زیر نظر مجموعے میں تین مضامین انگریزی سے ماخوذ ہیں: "رت جگا" مارک ٹوین کے "اے سلیپ لیس نائٹ" سے اور "آزادی میں پابندی" اے جی گارڈنر کے "دا رول آف دا روڈ" سے لیکن اس کوشش میں کہ ترجمہ نہ معلوم ہوں انھیں دیسی لباس میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ طبع زاد سے بن گئے ہیں۔ "مہربانی کرکے ——!" گارڈنر کے "آن سے اِنگ پلیز" کا ترجمہ ہے۔ باقی تمام مضامین اور کہانیاں طبع زاد ہیں۔

جن ادیبوں نے مجھے متاثر کیا ہے اُن کے طرزِ نگارش کی جھلک میری تحریروں میں نمایاں ہو جانا کوئی غیر فطری عمل نہیں ہے پھر بھی میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسٹیفن لیکاک کی طرح ابتدا میں کسی کی "نقالی" نہیں کی۔ انگریزی میں گارڈنر کو اور اُردو میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کو میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے، بقول آل احمد سرور کے پطرس ادبی دنیا کے لئے کبھی کے "مرچکے" اور بقول میرے رشید "ضعیف" ہو گئے اور میں "پیدا ہو رہا ہوں" اس لئے دعا کیجیے کہ "وراثت" کا مسئلہ لاینحل نہ رہے۔

میں "ادب برائے زندگی" کا قائل ہوں، اپنے محدود ماحول میں رہتے ہوئے بھی میں زندگی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے خیال میں زندگی "بحرِ بے کراں" ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ کہاں تک میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، اس کا فیصلہ پڑھنے والوں کے اختیار میں ہے۔ میں اس سلسلہ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں سچے واقعات افسانے کی صورت میں پیش کرتا ہوں، اور میرے کردار جیتے جاگتے اور پلاٹ اصلی

ہوتے ہیں، زیر نظر مجموعے میں تمام کہانیاں، اُن کے پلاٹ، اور کردار سب سچے اور اصلی ہیں، اور میرے ذاتی تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں صرف نام فرضی ہیں۔

آخر میں ضروری ہے کہ میں اپنے محترم مولانا سید محمد عبادت صاحب کلیمؔ، جنہوں نے مسودہ پر نظر ثانی فرمائی، اور محترمی جناب منظور حسین صاحب فاروقی اور اپنے دوست شری تاباںؔ نقوی، جنھوں نے علی الترتیب پروف اور کاپی کی اصلاح کی، شکریہ ادا کروں۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس موقع پر اپنی بیگم، بنیز عزیزہ سیدہ صدیقہ خاتون کا تذکرہ بھی کروں جن کی باہمی کوشش اور دلچسپی سے یہ مجموعہ اشاعت کی منزل تک پہنچا۔

سید سخی حسن

امروہہ - نومبر ۱۹۵۲ء

الائچی کی پڑیا

جب نوکر نے آواز دی ———

"یہ الائچیاں لے لو"!

نو رات کے نو بج چکے تھے، فضا بھیگی بھیگی تھی اور مئی کے مہینے میں ساون کا مزہ آ رہا تھا، گھر کے کچھ لوگ کھانا کھا چکے تھے کچھ کھانے میں مصروف تھے، اور کچھ جن کی تعداد بہت کم تھی، کھانے کے انتظار میں تھے۔ بچے کھا پی کر کبھی کے سو چکے تھے، بھابی جان دوسری حویلی کے صحن میں پلنگ پر بیٹھی بھائی جان کا راستہ تک رہی تھیں۔

الائچیوں کی پڑیا کھولنے والی بڑی آپا تھیں جنھوں نے الائچیاں منگوائی تھیں۔ اس مہنگائی کے زمانہ میں اوّل تو پان کھانا، پھر الائچیوں کے ساتھ! قیامت ہے۔ سارے گھر میں ایک بھی تو ایسا نہیں جو پان کے ساتھ الائچی نہ کھاتا ہو۔ منّا، چنّی، شہناز سب کے منھ میں اینٹ سی لگی رہتی ہے، اور تو اور اس گھر کی وہ لڑکیاں جو اسکول میں پڑھتی ہیں اور پاؤڈر اور لپ اسٹک کی دل دادہ ہیں پان کھانے سے نہیں بچ سکیں، خندان ہر وقت

مُنھ کو اگالدان بنائے رکھتی ہے پان بنا کر اسکول لے جاتی ہے ـــــــ

"پان کھانا چھوڑ دے لے شاہدہ"

یہ گیت بڑی آپا نے اُسی کی شان میں کہا تھا ـــــــ ادھر الائچی کی پڑیا کھلی اور الائچیاں ہاتھوں ہاتھ بٹ گئیں۔ اتنے بڑے گھر میں جس میں بڑوں سے لے کر ان بچوں تک جنھوں نے دودھ چھوڑ کر ابھی کھانا پینا سیکھا ہے، پان کے ساتھ الائچی کھانے کے شوقین ہوں، چار آنے کی الائچیاں بھلا کیا پکار کر سکتی ہیں، پڑیہ کھلتے ہی الائچیوں پر سب کے سب اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے مکھیاں مٹھائی پر۔ اور دو دو چار چار الائچیاں بانٹ لیں۔ بڑی آپا غریب کے ہاتھ ایک بھی نہ آئی۔

وہ دراصل خط پڑھنے میں لگ گئیں اور اتنی منہمک ہوئیں کہ یہ بھی بھول گئیں کہ الائچیوں کی اصل محرک وہی تھیں۔ اور محرک ـــــــ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے بنیادی حق سے محروم رہ گئی تھیں۔ بڑی آپا کی غیر معمولی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر میرے اندر یہ معلوم کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی کہ یہ کیسا خط ہے، کس کا ہے؟ اور کسے لکھا گیا ہے؟

ایک کے بعد ایک میرے دماغ میں یہ خیالات پیدا ہوئے اور میں نے بڑی آپا کے انہماک کو توڑنے کی ٹھان لی۔

کئی بار میں نے اُن سے خط کے بارے میں استفسار کیا اُن کی منت کی۔ ہم تھیں "ہماری بڑی آپا بڑی اچھی ہیں" کی رشوت دی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اس طرح

سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلتا دیکھ کر میں گوریلا طرزِ جنگ پر اُتر آیا اور آن کی آن میں خط بڑی آپا سے جھپٹ لیا۔ میں نے اُسے پڑھنا ہی شروع کیا تھا اور اس کا پتہ سرا دریافت کرنے کی فکر میں تھا کہ بڑی آپا نے موقع پا کر مجھ سے اُچک لیا۔ اور دوسرے لمحہ چکمہ دے کر میں نے بڑی آپا سے ایک بار پھر چھینا، خیریت یہ گزری کہ ہماری اس چھینا جھپٹی میں خط ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوا ورنہ سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا ہوتا۔ مکمل طور پر فتحیاب ہونے کے بعد میں نے بڑی آپا سے باعزت سمجھوتہ کر لیا جس کے بعد بڑی آپا اور میں نے دل ہی دل میں اُس خط کو پڑھنا شروع کیا۔

"

آپ کی ٹھکرائی ہوئی

فیروزہ گوہر"

یہ خط کا آخری صفحہ تھا اور قرینے سے صاف ظاہر تھا کہ اس سے پہلے اس کے ایک یا دو صفحے اور ہوں گے جو اس وقت غائب تھے۔ خط میلا کچیلا بھی تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی پرانا ہے۔ بڑی آپا پر اس وقت شرارت اور شوخی کا بھوت سوار تھا، نہ جانے اُنھیں کیا سوجھی کہ وہ خط لے کر دوسرے مکان میں جا دھمکیں؛ جہاں ہماری پڑھی لکھی بھابی جان "مجسّم انتظار" بنی، اپنی بچّی کو دودھ پلا رہی تھیں۔ بھابی جان نے خط بڑی آپا سے اس طرح لیا جیسے وہ معاملہ کی نزاکت اور اُس کے

پس منظر سے پہلے سے واقف ہوں۔

خط پڑھ کر بھابی جان کا منھ فق رہ گیا۔ چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ بڑی آپا کو چھیڑ سوجھی تو انھوں نے خط کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے، کتنا اچھا ہاتھ ہے اس لڑکی کا! کیسا اچھا مضمون لکھا ہے اس نے! کوئی پڑھی لکھی قابل معلوم ہوتی ہے انگریزی بھی جانتی ہے! ہا!! ———— بے چاری!" وہ اس کی ناکامی پر جیسے سچ مچ تاسّف کر رہی تھیں۔

بڑی آپا کا وار سَو فی صدی کامیاب رہا، بھابی جان میں رقابت کا جذبہ بیدار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ احساسِ کمتری اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا۔ انھوں نے جوں جوں غور کیا اُن کا شبہ یقین میں تبدیل ہوتا گیا ———— یہ آج کل بچّوں کی طرف سے بے توجہی کا یہی سبب ہے، انھوں نے اپنے دل میں کہا۔ میں دیکھ رہی ہوں ان دنوں کچھ رنگ ہی بدلا ہوا ہے، اب کی بار جو علی گڈھ سے آئے تو میرے اور بچّوں کے لئے کوئی چیز بھی نہ لائے، مُنّے کا سارا مُنھ پھنسیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کہتے کہتے زبان گھس گئی مگر کیا مجال جو اس کے بال بنوا دیئے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے بچے کسی اور کے ہیں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ مُنّے کے اس زور سے تھپّڑ مارا کہ بچّہ بلبلا اٹھا اور پانچوں انگلیاں گال پر ابھر آئیں۔ کل ہائی اسکول کی اُستانیاں آئی تھیں تو مس شُکلا سے کیسی ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں، دن بھر تو غائب رات کے دس بجے تک غائب! کہاں؟ کس کے لئے؟ خوب جانتی ہوں۔ اور یہ خط ———— ! اس کی اصلیت بھی

سمجھتی ہوں خوب سمجھتی ہوں۔

بھابی جان ان خیالات میں اتنی ڈوبیں کہ اپنے گرد وپیش سے بے خبر ہو گئیں۔ اس دوران میں بڑی آپا نے اُنھیں چونکا یا لیکن وہ وہاں ہوتیں تو جواب دیتیں۔ اب ذرا ہوش آیا تو جھنجھلانے لگیں حالانکہ ابھی خاصی ہوا چل رہی تھی اور گرمی کیسی خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ فوراً اُنھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اُنھوں نے اپنی بدحواسی کو چھپانے کے لئے قریب پڑی ہوئی ایک کتاب اُٹھالی اور اُس کی ورق گردانی کرنے لگیں لیکن اس پر بھی دل نہ لگا تو مجبوراً بڑی آپا سے خط مانگا جس میں اب تک دل اٹکا ہوا تھا اور ایک بار پھر شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اس مرتبہ اُنھوں نے اس میں سے نئے نئے پہلو نکالے اور نئے نئے گوشے دریافت کئے۔ اس دلچسپ کام میں بڑی آپا اُنھیں برابر مدد پہنچاتی رہیں۔

بڑی آپا کی رائے تھی کہ خط لکھنے والی کوئی انگریزی پڑھی لکھی ہے لیکن اس سے بھابی جان کی انفرادیت مجروح ہوتی تھی اس لئے وہ بڑی آپا کے اس خیال کی نا ئید کرنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ بھابی جان کے نزدیک انگریزی کا ایک لفظ استعمال کرنے سے کوئی انگریزی داں نہیں کہلا سکتا، اُنھوں نے اپنے خیال کی تائید میں اپنی ایک ملونی ادبہن کی مثال پیش کی جو معمولی پڑھی لکھی ہیں اور اس سے کہیں بہتر خط لکھ سکتی ہیں اور انگریزی کے ایک چھوڑ چار چار لفظ استعمال کرتی ہیں۔

بھابی جان دراصل اپنے دل کو سمجھانا چاہتی تھیں کہ لکھنے والی تعلیم کے لحاظ سے

اُن سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اور وہ پھر خط کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مصروف ہو گئیں، اب کے اُنھیں نئے نئے خیالات نے سہارا دیا، کتنی بد سلیقہ ہے اس خط کی لکھنے والی! وہ سوچنے لگیں، جس کا سر ہے نہ پیر! ایک بدبودار میلا کچیلا چیتھڑا! خط لکھنے کے لئے چڑیل کو اس سے اچھا کاغذ میسر نہ آسکتا تھا، بدتمیز کہیں کی! صورت شکل کا اندازہ تو اسی سے ہو گیا کہ بڑی بی بقولِ خود "ٹھکرائی ہوئی" ہیں۔ میرا اس کا کیا مقابلہ! میری پاؤں کی جوتی کی برابر بھی نہیں ہو سکتی وہ!

خط کے متعلق بڑی آپا نے ایک اور رائے ظاہر کی جس سے بھابی جان پریشان ہو گئیں اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑی آپا کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ خط پرانا ہے اس لئے میلا کچیلا ہے یہ حقیقت قایم ہوتے ہی بھابی جان نے جو الزامات خط لکھنے والی پر اس سلسلہ میں رکھے تھے وہ سب ختم ہونے تھے اس لئے اُنھیں یہ بات تسلیم کرنے میں تامل ہو رہا تھا، اُنھوں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ خط شادی سے پہلے کا ہو۔ لیکن شادی سے پہلے کے جتنے خطوط اس قسم کے ہو سکتے تھے وہ اُنھوں نے بچشم خود دیکھے تھے اور اس خط اور اس کی لکھنے والی کا تذکرہ اُن سے کبھی نہیں کیا گیا تھا، اگر خط پرانا ہوتا تو لازمی طور پر اُن کے علم میں آنا چاہئے تھا۔ معاملہ اصل میں یہ تھا کہ "فیروزہ" نام کی ایک طوائف اُن دنوں شہر میں آئی ہوئی تھی جس کے حُسن کے بڑے چرچے تھے اور جس نے شہر کے بیشمار نوجوانوں کو اپنے دام میں پھانس رکھا تھا۔ بھابی جان کا خیال تھا کہ یہ خط اُسی فیروزہ کا ہے اور تازہ ہے۔

اب دس بجنے والے تھے اور وہ انتظار کرتے کرتے تنگ آگئی تھیں اس لئے اب انھیں بھائی جان پر واقعی غصہ آنے لگا پہلی جھونجل اُس بچی پر اتری جواب تک دودھ چھوڑ رہی تھی اور کسی طرح چھوڑنے میں نہ آتی تھی، اُس سے زبردستی دُودھ تڑایا تو وہ تڑپ اُٹھی، ڈیڑھ برس کا جی اور اس پر "سوتن" کی آمد اور دودھ کی نہوت! وہ معصوم بچی کیا جانے اس بھید کو! اس کا پیٹ نہ بھرے تو وہ دودھ کیسے چھوڑدے بھلا؟ اس زبردستی پر وہ اس طرح بلبلائی جیسے کسی نے سُوئی چبھو دی ہو معصوم بچّی کے پاس احتجاجی مظاہرے کے لئے رونے کے سوا اور کیا ہتھیار ہو سکتا ہے اس کے اس طرح رونے پر اس کے بجائے کہ اسے تسکین وتشفی دی جاتی، چمکار کر پیار کیا جاتا، کندھے سے لگایا جاتا یا کسی چیز سے پیٹ بھرنے کی کوشش کی جاتی، ہماری پڑھی لکھی بھابی جان نے اُلٹا اسے مارا، اس پر بچی نے بھی انتقام لینے کی ٹھان لی اور اس زور سے روئی کہ سارے گھر کو اُٹھا دینا تو اس کے بس کی بات نہ تھی البتہ اپنے بھائی کو جو عمر میں اُس سے صرف سوا برس بڑا تھا جگا ڈالا، اب تک وہ رونے والی تنہا تھی اب اس کے ساتھ اس کا بھائی بھی ہو گیا جب دونوں نے مل کر ایک سُر میں رونا شروع کیا تو سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ اب بھابی جان کے غصے کا پارہ انتہائی درجے پر پہنچ گیا اور انھوں نے دونوں کو خوب دھونسا، منّا جو سوتے سوتے اچانک جاگا تھا اور نہ جانے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اُٹھا تھا، یکایک مار کھا کر سہم گیا اور معصومیت سے ماں کو تکنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی اور رحم کی اپیل، وہ بچارہ

تو مجبوراً چپ ہو گیا لیکن اس کے اور "منّی" کے معاملہ میں فرق تھا، وہ بھوکی تھی اور اپنا حق مانگ رہی تھی، اس وقت اُس کے جذبات وہ تھے جو بھوکے عوام کے ہوتے ہیں، بھوک میں انسان سب کچھ کر گذرتا ہے، چوری کرتا ہے ڈاکہ ڈالتا ہے، جیل جاتا ہے اور جب پھانسی کے تختے پر لٹکایا جاتا ہے تو مسکراتے ہوئے جان بھی دے دیتا ہے اس وقت بچی بھی بھوک میں جان پر کھیل رہی تھی اُسے جتنا پیٹا جا رہا تھا اتنی ہی شدت سے رو کر وہ اپنی بغاوت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

ایسا پڑھا لکھا ہونا بھلا کس کام کا؟ میں نے اپنے دل میں کہا جو لڑکی میں "بہترین بیوی" اور "بہترین ماں" بننے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکے، میری رائے میں لڑکیوں کا نصاب تعلیم اور درسگاہیں لڑکوں سے مختلف ہونی چاہئیں جن میں بچوں کی نفسیات اور سینے پرونے کے علاوہ صرف وہ حساب پڑھایا جائے جس کی مدد سے لڑکی گھر کا بجٹ بنا سکے، صرف وہ تاریخ پڑھائی جائے جس کے ذریعہ سے وہ بچوں کی سیرت ڈھال سکے اور صرف وہ جغرافیہ اور سائنس سکھایا جائے جس کے سہارے وہ بچوں کی معلومات میں اضافہ کر سکے۔

لڑکیوں کی درسگاہیں گویا ٹریننگ سینٹر ہوں جہاں اُنھیں "بہترین بیوی" اور "بہترین ماں" بننے کے لئے تیار کیا جائے، یہ ٹریننگ ہر لڑکی کے لئے ضروری قرار دی جائے اور جب لڑکی یہ حاصل کر چکے تب اُسے دوسری شاہراہوں سے گزرنے کی اجازت دی جائے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے، ڈاکٹری پڑھے، پروفیسر بنے یا جرنلسٹ

یا چاہے گھر بیٹھے لیکن صرف اس وقت جب وہ مقررہ ٹریننگ حاصل کر چکے، کیونکہ ہر لڑکی جو دُنیا میں پیدا ہوتی ہے اُسے ایک نہ ایک دن بیوی اور ماں بننے کی منزلوں سے ضرور گزرنا ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے ہماری بھابی جان نہ اچھی بیوی ہیں نہ اچھی ماں، بچّوں کو مار پیٹ کر بھابی جان کے پوری طرح ٹھنڈک نہ پڑی تھی کہ قضا کے مارے بھائی جان آ پہنچے، اور ہماری پڑھی لکھی بھابی جان کو جو ابھی "بہترین ماں" ہونے کا ثبوت دے چکی تھیں اب "بہترین بیوی" ہونے کے ثبوت دینے کا موقع مل گیا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور بھائی جان کو آج کلب سے لوٹنے میں واقعی دیر ہو گئی تھی اس لئے بھابی جان نے اُن کا فوراً استقبال کیا۔

"ابھی کیا ضرورت تھی آنے کی؟ ——— ابھی تو صرف دس بجے ہیں" اُنھوں نے طنز کیا۔

"کیوں؟ ——— بھائی جان نے سادگی سے کہا ——— "کوئی ضروری کام تھا آج؟ خیریت تو ہے؟

"جی ہاں! اب سنبھا لئے اپنی اولاد کو!"

بھابی جان کے نتھنے پھیلے ہوئے تھے منہ سوجا ہوا تھا اور ماتھے پر اتنی شکنیں تھیں کہ شمار میں نہ آسکتی تھیں۔

"الٰہی خیریت رکھنا مزاج یار برہم ہے"

فی البدیہہ مصرع پڑھتے ہوئے بھائی جان غصّے کو ٹالنے کے لئے بے پروائی سے کمرے میں چلے گئے اور کپڑے تبدیل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بھابی جان اس وقت لڑائی کے موڈ میں تھیں اس لئے بھائی جان کی اس بے اعتنائی پر اور جل گئیں اور جتنی دیر بھائی جان کپڑے بدلتے رہے وہ بڑبڑانے میں مصروف رہیں

کپڑے بدل کر آئے تو بھائی جان نے سنجیدگی کے ساتھ بیوی سے ناراضگی کا سبب پوچھا مگر وہاں تو یہ معلوم ہوا جیسے جلتی ہوئی آگ پر کسی نے چھینٹا دے دیا، اور اب بڑی آپا خطرے کر جسپٹ ہو چکی تھیں اس لئے بھابی جان کو تنہائی میں بھائی جان سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدان خالی مل گیا۔

"مجھے سب معلوم ہو گیا!"

بھابی جان نے پر وثوق انداز میں بھرپور وار کیا۔

"سچ؟!" بھائی جان نے بات کو مذاق میں اُڑانے کے لئے وار خالی دینے کی کوشش کی

"بڑے ننھے بنتے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں، بیوقوف اُسے بنائیے جسے کچا چٹھا معلوم نہ ہو۔"

"کیسا کچا چٹھا! آخر ماجرا کیا ہے؟"

بھائی جان کی سادگی پتہ دے رہی تھی کہ معاملہ کی نوعیت سے بالکل بے خبر ہیں

"نادان نہ بنئے تجاہل سے کام نہ چلے گا۔ صاف صاف بتائیے وہ کون چڑیل ہے جس کے خط آپ کے پاس آتے ہیں اور جن کا آج تک مجھ سے ذکر نہیں کیا گیا۔"

بھابی جان کے لہجہ میں ترشی اور آواز میں کافی تیزی پیدا ہو چکی تھی اس کے برعکس بھائی جان ابھی تک مذاق کے موڈ میں تھے۔

"میں قسم سے کہتا ہوں کہ میرے پاس کسی چڑیل کے خط نہیں آتے۔ میرے پاس تو صرف تمہارے خط آتے ہیں جب میں باہر ہوتا ہوں"

"ہاں ہاں اب مجھے صاف صاف چڑیل کیوں نہیں کہہ دیتے" بھابی جان بے تکے پن سے بولیں۔

"بیوی! میں تو تمھیں کچھ بھی نہیں کہہ رہا تم سے زیادہ میرے لئے کون ہو سکتا ہے!" بھائی جان نے غصہ کو تھوکا۔

"اب ان چکنی چپڑی باتوں سے کام نہیں چلے گا یہاں بلایئے اس چڑیل کو، یہاں میرے سامنے، چٹیا نہ رگڑ ڈالی ہو تو سہی"

کس چڑیل کو؟ ذرا معلوم تو ہو بیگم! ——— میں ضبط کئے جا رہا ہوں اور تم ہو ——— کہ بڑھی چلی جا رہی ہو تم نہیں جانتیں میں—"

اور بھائی جان کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن بھابی جان نے اپنی طرف سے جملے پورے کرنے شروع کر دیئے ——

"جانتی ہوں خوب جانتی ہوں تم مجھے گھر سے نکال سکتے ہو، طلاق دے سکتے ہو، دوسری شادی کر سکتے ہو، کیا نہیں جانتی میں سب کچھ جانتی ہوں، اور تم بھی جانتے ہو میں کیا کر سکتی ہوں ——— میں ——— میں زہر

پی سکتی ہوں ـــــ میں ـــــ!"

"چپ رہو!!!"

بھائی جان اس زور سے گرجے کہ سوتے ہوئے بچوں کے کلیجے دہل گئے۔

"خواہ مخواہ کاٹنے کو دوڑ رہی ہو، تم پر اس وقت لڑائی کا بھوت سوار ہے، تم اس وقت بات کرنے کے قابل نہیں ہو"

یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے اور غصے کے زور میں ٹہلنے لگے ـــــ پھر بھائی جان اور بھابی جان میں رات بھر لڑائی ہوئی بھائی جان خوب خوب گرجے اور بھابی جان جی بھر کے کڑکیں، اتنی گرج اور کڑک کے بعد بارش ضرور ہوتی ہے اس لئے بھابی جان خوب روئیں اور طوفان کے بعد فضا پر سکون ہو جاتی ہے چنانچہ میاں بیوی میں بول چال بند ہو گئی کوئی ایک ہفتہ بعد صلح ہوئی ـــــ

غالباً بھابی جان کو پتہ چل گیا کہ یہ سب قصور اس فتنہ پرور پڑیا کا تھا جس میں الائچیاں بندھ کر آئی تھیں ـــ!

مچھر

سب جانتے ہیں کہ موسیقی ایک جادو ہے، پھر ہندوستان کی موسیقی فنی اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایسے اُستاد گذرے ہیں جنھیں اپنے فن میں اتنا کمال حاصل تھا کہ دیپک راگ چھیڑتے تو آگ لگ جاتی اور میگھ راگ الاپتے تو مینھ برسنے لگتا تھا لیکن ہم بیسویں صدی میں رہنے والوں کو یہ سب باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں، شاید اسی لئے لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں موسیقی دم توڑ رہی ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آج کل مذاق بدل گئے ہیں، لیکن یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ موسیقی روبہ زوال ہے، اس میں شک نہیں کہ مذاق ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اسی لئے یہ بھی ممکن ہے کہ آج کل لوگوں کا رجحان فن اور آرٹ سے ہٹ کر فلمی گانوں کی طرف زیادہ ہو گیا ہے، دراصل کسی فن کی ترقی یا تنزل سرپرستوں پر منحصر ہے جو خوش قسمتی سے فنِ موسیقی کو ہر زمانہ میں حاصل رہے، بہت پرانے زمانے میں گپت بادشاہوں نے اور درمیانی دور میں مغلوں نے اس فن کی سرپرستی

کی۔ دَورِ حاضرہ میں اس کام کو میونسپلٹیوں نے سنبھال لیا ہے چنانچہ آج کل کی موسیقی کا تان سین مچھر ہے جو اپنے گانے سے دن رات ہماری تواضع کرتا رہتا ہے۔ فرض کیجیے، کسی وقت میں خدانخواستہ موسیقی کے ماہروں کا فقدان بھی ہو جائے تو گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ ماشاءاللہ استاد مچھر سین بہرحال کہیں جانے والے نہیں ہیں اور اب تو میونسپلٹیوں کے حسنِ انتظام سے اُن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مچھر اپنا سُریلا نغمہ رات کو سُنانے کا عادی ہے، اول تو مچھر کئی کئی مچھروں کے ساتھ کورس میں گانا پسند کرتا ہے اور جب تنہا گاتا ہے تب بھی اس قدر خود اعتمادی کے ساتھ گاتا ہے جیسے آپ بس اسی کا گانا سننے کے لئے گوش بر آواز تھے۔ قدرت نے ہر ذی رُوح میں علیحدہ صلاحیت رکھی ہے، مچھر کو صرف کان میں گانے کا ملکہ عنایت کیا ہے۔ اس کے گانے کو ہم ایک کان سُن کر دوسرے کان نہیں اُڑا سکتے۔ کیونکہ جب ہم اُسے ایک طرف سے رخصت کرنے کے لئے "شب بخیر" کہتے ہیں تو وہ جھٹ دوسرے کان میں آ کر وہی راگ الاپنے لگتا ہے، یہ پہچاننا بھی مشکل ہے کہ یہ وہی مچھر ہے یا کوئی اور۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بعض اوقات کان کے دروازہ پر گانے والے مچھروں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ گویا کان پور میں شادی رچائی جا رہی ہے اور باہر بھانڈوں کا ناخواندہ گروہ انعام مانگنے کھڑا ہے۔

گانا بجانا مچھر کا ایک شوقیہ مشغلہ ہے جس سے وہ کبھی کبھی دل بہلایا کرتا ہے، ورنہ اس کا آبائی پیشہ سپہ گری ہے جو نسلاً بعد نسلٍ اس کے خاندان میں چلا آرہا ہے۔ بے شک وہ ایک بہادر سپاہی کی طرح جان جوکھوں میں ڈال کر ہر وقت انسان جیسے قوی الجثہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، لیکن وہ عربی طرز کی انفرادی لڑائی کا قائل ہے میدان میں آکر رجز خوانی کے بعد فوراً مبارز طلبی کرتا ہے اور پھر جنگ میں مصروف ہو جاتا ہے، اس کی ہمت، دلیری اور عالی ظرفی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ تنہا حملہ کرتا ہے اور وار کرنے سے پہلے ہمیشہ حریف کو خطرہ کی اطلاع دے دیتا ہے، دشمن کو آگاہ کئے بغیر حملہ کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے اس کا حملہ نہایت خطرناک ہوتا ہے جس کا جواب دینا مذاق نہیں ہے اچھے اچھے پہلوان اُس کے سامنے کان ٹیک چکے ہیں، انسان تو خیر چیز ہی کیا ہے مچھر کی وہ ذات ہے جس کے مقابلہ میں شیر جیسا خونخوار درندہ پناہ مانگ چکا ہے وہ چاہے تو آپ سے ناک رگڑوا سکتا ہے کبھی آپ کو کان کھجانے پر مجبور کر دے، کبھی کراہیں، کبھی آپ داہنی کروٹ لیں، کبھی بائیں اس کی مرضی ہو تو ذرا سی دیر میں آپ کو لہو لہان کر دے، آپ سر سے پاؤں تک زخموں میں چور چیختے ہی رہیں اور وہ آپ کی ہیئتِ کذائی پر قہقہے لگایا کرے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ انسان بغیر ہاتھ پاؤں مارے ہتھیار ڈال دیتا ہے اپنی سی وہ بھی کرتا ہے جھنجھلا جھنجھلا کر مچھر پر وار کرتا ہے لیکن مچھر ایک ماہر کھلاڑی کی طرح پھرے

ہوئے سانڈ کے حملے کو خالی دے کر اس طرح پینترا بدلتا ہے کہ وار خود اپنے اوپر آجاتا ہے۔ انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک منظر کوئی نہیں۔

انسان اگر عاجز ہے تو مچھر کے مقابلہ میں، آج انسان نے دنیا کی ہر چیز کو تسخیر کر لیا ہے آگ، پانی، ہوا سب اس کے قبضہ میں ہیں، نہیں ہے تو مچھر۔ اب تک جو طریقے مچھر پر قابو پانے کے لئے ایجاد ہوئے ہیں وہ اس کو مارتے ہیں نہیں صرف دور بھگا دینے میں کامیاب ہوئے ہیں، تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ "فلٹ"، قسم کی دوائیاں سب بیکار ہیں۔ ان سے مچھر چند گھنٹوں کے لئے ادھر اُدھر چھپ جاتا ہے، مرتا نہیں ہے "اگر" اور "لوبان" کی دھونی سے اُنھوں نے بھاگنا یا چھپنا بالکل بند کر دیا کیونکہ آپ سمجھئے پھر بھی ایٹم کے دور میں رہنے والا مچھر ہے اور ان دقیانوسی طریقوں سے کبھی کا واقف ہو چکا ہے، رہ گئی مچھر دانی اس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ مچھر ہم سے دور رہیں لیکن مچھر کو اس کے اندر گھسنے کا طریقہ ایجاد کئے عرصہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد مچھر اُس کے اندر ایسا پھنستا ہے جیسے چوہے دان میں چوہا، پھر جو مچھر ایک بار اندر چلا جاتا ہے وہ کاٹ کاٹ کر قیمہ ہی تو کر ڈالتا ہے گویا مچھر دانی خود اپنے پھانسنے کا جال بن جاتی ہے سنتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں مچھر ہوا سے بھاگا کرتے تھے لیکن آج کل مچھروں نے حفظانِ صحت کے جدید اصول پر کاربند ہو کر اپنا قد و قامت اور وزن اس قدر بڑھا لیا ہے کہ پچھتر فی صدی مچھر بہت تیز آندھی کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کر لیتے ہیں، اگر آپ کو بہت موٹے تازہ

مچھر دیکھنے کا اشتیاق ہوا تو علی گڑھ چلے جایئے جہاں مچھروں کی پرورش کا خاص انتظام کیا جاتا ہے، علوم کی طرح علی گڈھ بہترین قسم کے مچھروں کا مرکز اور یہ یونیورسٹی مچھروں کو پہلوان بنانے کی بہترین نرسری ہے۔

اپنے پیدائشی مقام کو بھول جانا ایک کمزوری ہے جو انسان اور مچھر دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ مثلاً گاؤں کے کسی مفلس گھر میں پیدا ہونے والا آدمی جو کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاتا ہے وہ اپنے گھر، عزیزوں، حتیٰ کہ ماں باپ تک کو بھول جاتا ہے بعینہٖ یہی حال مچھر کا ہے۔ مچھر شہر کی گندی نالیوں اور کوڑا گھروں میں جنم لیتا ہے لیکن وہ بہت جلد اس گندہ ماحول کو چھوڑ کر عمدہ اور نفیس مکانوں میں رہنے لگتا ہے۔ اسے گندگی سے سخت نفرت ہے، اسے امیروں کے سجے سجائے عالیشان مکانوں پر قبضہ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اگر آپ کو مچھروں کی کسی "نئی بستی" کی زیارت کرنی ہو تو کسی دن کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑوں کو معمولی سی جنبش دے دیجئے، مچھروں کا جم غفیر آپ کے استقبال کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔

مچھر اور انسان کی دشمنی بہت پرانے زمانہ سے چلی آ رہی ہے، اس کی ذمہ داری مچھر پر ہے لیکن مچھر کے نزدیک اس کا الزام انسان کی گردن پر ہے مچھر کا کہنا ہے کہ اخباروں پر چونکہ انسان کا قبضہ ہے اس لئے اسے مچھروں کے خلاف پروپگنڈا کرنے کا خوب موقعہ مل گیا ہے حالانکہ اس کی اصلیت کچھ بھی نہیں، اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ کبھی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس میں تھوڑا تھوڑا

قصور دونوں ہی فریق کا ہے، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں، سوچنے کی بات یہ ہے کہ مچھر آخر ہمارا کیا بگاڑتا ہے غالباً اس سے زیادہ تو اس کا قصور نہیں کہ وہ ہمارے خون کی ایک معمولی بوند نکال کر اپنے جسم میں ڈال لیتا ہے اور بس۔ سو یہ بہت سے انسان بھی کرتے ہیں بلکہ وہ تو اپنے بھائیوں کا خون چوس چوس کر ادھ مرا کر دیتے ہیں ہر طاقتور کمزور کو دباتا ہے، امیر غریبوں پر ظلم کرتے ہیں، زمیندار کاشتکار کو ستاتے ہیں، سرمایہ دار مزدوروں کا گلا گھونٹتے ہیں اور ہم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے، پھر مچھر بیچارے کی کیا شکایت! اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ہمارے خون کا وہ معمولی قطرہ ہی اس کی واحد غذا ہے اسی کے سبب سے وہ جیتا ہے اور وہی اس کا سرمایۂ حیات ہے، نہ وہ بے ضرورت مانگتا ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ لیتا ہے، ایک بوند گھٹ جانے سے ہم دبلے نہیں ہوتے البتہ وہ موٹا ہو جاتا ہے ہمارا وزن کم نہیں ہوتا اس کا بڑھ جاتا ہے۔ پھر باہمی مفاہمت کی اس سے بہتر کونسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ ہم مچھر کے سامنے خاموشی سے سر تسلیم خم کر دیں اگر ہم واقعی بڑے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اپنے طرز عمل سے اُسے ایثار کی تعلیم دیں اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مچھر کے مقابلہ میں عزت اور وقار قایم رکھنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔

رت جگا

جب ہم ہوٹل واپس لوٹے تو میں نے "راہ پیما" کو ٹھیک کر کے جیب میں رکھا اور سونے کی تیاری میں مصروف ہو گیا چونکہ اگلے دن بھی ہمیں اس سے کام لینا تھا اور یہ جانچنا تھا کہ ہم نے کتنی منزل طے کی، اس لئے میں نے یہ سمجھ کر کہ وہ دن بھر کام دینے کے بعد بھی نہیں تھکا ہے، غریب کو آرام دینے کی بجائے پھر کام پر لگا دیا۔

دس بجے تک ہم بستر کے اندر پہنچ گئے کیونکہ اگلے دن ہمیں سویرے اٹھ کر پھر چلنے کی تیاری کرنی تھی۔ میں کچھ دیر سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلتا رہا، مگر شاید لیٹتے ہی سو گیا۔ لیٹتے ہی سونے والے آدمی سے مجھے نفرت ہے۔ میں اس حرکت میں ایسی کیفیت پاتا ہوں جس کی تعریف لفظوں میں نہیں کی جا سکتی۔ اسے قطعی طور پر توہین بھی نہیں کہہ سکتے لیکن پھر بھی وہ ایسی کیفیت ضرور ہوتی ہے جو توہین کی برابر ہوتی ہے اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔

بہر حال میں نے یہ روحانی اذیت برداشت کی اور مجبوراً سونے کی کوشش کرنے لگا

لیکن جتنی جتنی میں نے سونے کی کوشش کی اُتنی ہی نیند نے قریب آنے کی قسم کھالی، تنہائی اور اندھیرے سے میری طبیعت گھبرا گئی، نیند میرا ساتھ دینے سے انکار کر رہی تھی، بس اس وقت میں تھا، تنہائی تھی اور گھپ اندھیرا، یا وہ غذا جو پیٹ میں موجود تھی اور ہضم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔

رفتہ رفتہ میرا دماغ بھٹکنے لگا، دُنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو اس وقت میرے ذہن میں نہ آیا ہو لیکن میں ہر موضوع کے صرف ابتدائی حصّے پر غور کرتا تھا اس سے آگے میں ایک بار بھی نہ بڑھ سکا۔ یکے بعد دیگرے مختلف موضوع میرے ذہن میں آئے لیکن بس آیا اور گیا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ جم کر کسی ایک پر بھی میں غور نہ کر سکا یہ عمل تیزی کے ساتھ جاری رہا اور اس میں بڑے اطمینان سے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میرا سر چکرانے لگا، تھکن کے مارے میں مرا جا رہا تھا آخر کار غنودگی طاری ہونے لگی، یقیناً یہ بڑھ کر بہت جلد خوابِ غفلت میں تبدیل ہو جاتی لیکن ——— یہ کیا؟

پژمردہ اور تھکے ہوئے بدن میں جیسے جان پڑ گئی، بہت دُور کچھ سنائی دیا اور بہت جلد یہ معلوم ہونے لگا کہ یہ کوئی آواز ہے۔ یہ آواز اب ہمارے قریب آتی جا رہی تھی، پہلے معلوم ہوتا تھا آواز کوئی میل بھر دُور سے آ رہی ہے جیسے کوئی بھاری طوفان آ رہا ہو لیکن اب وہ اور نزدیک آ چکی تھی کوئی دو فرلانگ پر اور معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی بل کی آواز ہے۔ نہیں نہیں وہ اور قریب آ گئی اور محسوس ہوا جیسے کوئی فوج "لفٹ رائٹ" کرتی ہوئی چلی جا رہی ہے، لیکن اب تو وہ بالکل قریب یعنی اُسی کمرہ میں سنائی

دے رہی تھی، جی ہاں یہ چوہے کے لکڑی کترنے کی آواز تھی۔ لیجئے میں اس معمولی سی بات کے لئے اتنا پریشان ہو رہا تھا۔

بہر حال کیا کیا جا سکتا تھا اب پھر سونا چاہئے میں نے اپنے دل میں کہا اور جو وقت اس اُلجھن میں ضائع ہو گیا اُس کی کمی پوری کرنی چاہئے، غیر ارادی طور پر میں نے اُسی آواز پر کان لگا دیئے۔ رفتہ رفتہ مجھے آواز کے کھٹکے شمار کرنے میں لطف آنے لگا۔

فوراً ہی اس کام سے بھی طبیعت اُکتا گئی، اگر چوہا اپنے کام کو کچھ دیر مسلسل جاری رکھتا تو میں صورتِ حال کو زیادہ دیر تک برداشت کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا وہ بار بار رُک جاتا اور کچھ وقفہ کے بعد اپنا عمل جاری کرتا جب وہ ٹھہر جاتا تو میں اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ اپنا سلسلہ شروع کرے اور مجھے اتنی دیر برابر اُلجھن رہتی، لیکن جب وہ اپنا کام شروع کر دیتا تو مجھے پھر لطف آنے لگتا۔

شروع شروع میں یہ حال تھا کہ میں چوہے کی گرفتاری پر پانچ، چھ، سات، دس، روپیہ تک انعام دینے کے لئے تیار تھا لیکن بعد میں انعام کی رقم اتنی بڑھ گئی کہ قابو سے باہر ہو گئی۔ میں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آواز بڑے اطمینان سے بدستور آ رہی تھی جیسے کسی نے مائکروفون لگا دیا ہو۔

میرا غصہ بڑھتے بڑھتے پاگل پن کی حد تک پہنچ گیا۔ آخر کار میں نے وہ کرنے کا فیصلہ کیا جو ہر شخص کو ایسے موقع پر کرنا چاہئے، یعنی میں نے طے کیا کہ بول نہ کوئی چیز پھینک کر اس کے ماری جائے۔ میں نے جھک کر پلنگ کے نیچے سے جوتا اُٹھایا اور بستر پر بیٹھ کر یہ اندازہ لگانے

کی کوشش کرنے لگا کہ آواز واقعی کس طرف سے آرہی ہے۔ اس کوشش میں میں ناکام رہا کیونکہ یہ اندازہ لگانا کہ آواز کدھر سے آرہی ہے اتنا ہی ناممکن تھا جتنا جھینگر کی آواز کا اندازہ لگانا ہوا کرتا ہے، جہاں سمجھئے کہ جھینگر یہاں بول رہا ہے تو ہمیشہ وہ جگہ ٹھیک سا وہی ہوتی ہے جہاں وہ نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر میں نے ہوائی فیر کرنے کا فیصلہ کیا اور نشانہ کا اندازہ لگائے بغیر پورے زور کے ساتھ جوتا کھینچ مارا۔ جوتا شاہد کے سر کے اوپر والی دیوار سے ٹکرا کر ٹھیک شاہد کے اوپر گرا۔ یہ میرے خیال میں بھی نہ تھا کہ میں جوتا اتنی دور پھینک سکوں گا۔ جوتے کی آواز نے شاہد کو جگا دیا اور جب تک مجھ کو یہ نہ معلوم ہو گیا کہ وہ ناراض نہیں ہے مجھے اطمینان نہ ہوا، لیکن فوراً ہی چوہے نے اپنا عمل پھر جاری کر دیا جس سے میرے غصہ کا پارہ انتہائی درجہ پر پہنچ گیا۔

میں دوسرا جوتا پھینک کر شاہد کو دوبارہ جگانا نہ چاہتا تھا لیکن چوہے کی آواز بدستور آرہی تھی اور میں دوسرا جوتا پھینکنے پر مجبور ہو گیا۔ اس بار جوتے نے ایک آئینہ توڑا، کمرے میں دو آئینے تھے اُن میں کا بڑا اس مرتبہ میرے ہاتھ سے ٹوٹا۔ شاہد پھر جاگ اٹھا مگر چونکہ اس نے شکایت نہیں کی اس لئے مجھے دکھ ہوا، میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب میں شاہد کو تیسری بار جگانے کی بجائے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہونگا۔

چوہے کی آواز خود بخود بند ہو گئی اور یک گونہ سکون محسوس کر کے رفتہ رفتہ میں

سونے کی طرف پھر متوجہ ہو رہا تھا کہ یک لخت ایک گھنٹہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ بیکار پڑے پڑے میں نے اور کچھ نہیں تو گھنٹے ہی شمار کر ڈالے، گھنٹہ تھما تو فضا پر قدرے سکون اور مجھ پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے والی تھی کہ ایک دوسرے گھنٹے نے بجنا شروع کر دیا، میں نے پھر گھنٹے شمار کیے، وہ تھما تو گھنٹہ گھر اور تھانے کے گھنٹوں نے ایک ساتھ بج کر ایسی سُریلی اور رسیلی آوازیں پیدا کیں جو اس سے پہلے سننے میں نہ آئی تھیں۔ خیر یہاں تک ٹھیک تھا مگر جب اُنھوں نے گجر بجائے تو میں نے کہا یہ زیادتی ہے! بہر حال میں سو نہ سکا۔ صورت یہ تھی کہ ہر دفعہ جب میں سونے کا ارادہ کر کے لیٹتا تو کوئی نہ کوئی آواز مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتی اور میں باقاعدہ جاگنے لگتا، ایک وقت یہ بھی تھی کہ ہر مرتبہ میری رضائی نیچے گر پڑتی اور مجھے اُسے تلاش کرنے اور اُٹھانے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔

بالآخر نیند کا سارا خمار رخصت ہو گیا۔ میں باقاعدہ جاگنے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ پیاس بھی انتہائی شدت سے لگ رہی تھی، لیٹے لیٹے معاً ایک نئے خیال نے کروٹ لی، میں نے سوچا موسم خوشگوار ہے اگر اس وقت کپڑے بدل ڈالے جائیں اور باہر نکل کر سگرٹ کے دو کش لگائے جائیں اور ٹھنڈی اور تازی ہوا کھائی جائے تو بڑا لطف رہے اور باقی ماندہ رات بڑی آسانی سے کٹ جائے۔

مجھے یقین تھا کہ میں اندھیرے میں بغیر شاہد کو جگائے کپڑے تبدیل کرنے میں

کامیاب ہو جاؤں گا۔ جوتے میں چوہے کے سلسلہ میں پہلے ہی کھو چکا تھا، باہر جانے کے لئے سلیپر بھی کام دے سکتے تھے، خیریت سے ایک سلیپر میرے پاس موجود بھی تھا، اب سوال صرف دوسرے سلیپر کا رہتا تھا، یہ طے کر کے میں دوسرے سلیپر کی تلاش میں چپکے چپکے آہستہ آہستہ اُٹھا مگر سلیپر یوں آسانی سے بھلا کہاں ہاتھ آنے والا تھا، اور اس کا تلاش کرنا بھی از بس ضروری تھا۔ اس لئے میں نے چوپاؤں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا، پوزیشن یہ تھی کہ ایک سلیپر میرے ہاتھ میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں آستہ ٹٹول رہا تھا اور بڑی احتیاط سے گھٹنوں گھسٹ رہا تھا۔ اس ہتھکنڈے سے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی ہار کر مجھے اپنی گردش کو وسعت دینی پڑی ہر اس احتیاط میں کہ کسی قسم کی آواز نہ پیدا ہو میں نے جسم کا سارا بوجھ گھٹنوں پر ڈال رکھا تھا اور پنجوں کے بل بڑی احتیاط سے سرک رہا تھا لیکن بہر حال کھس کھساہٹ پیدا ہو رہی تھی اور ہر مرتبہ جب میں کسی چیز سے ٹکراتا تو آواز دن کے مقابلہ میں ۳۵ یا ۳۶ گنی سنائی دیتی، ایسے موقعوں پر میں ہر بار ڈر کے مارے اُچھل پڑتا مبادا شاہد نہ جاگ اُٹھے اور پورا اطمینان کرنے کے بعد میں پھر چل پڑتا۔

میں اسی انداز سے چلتا رہا مگر سلیپر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ سوائے میز کرسی کے وہاں میرے ہاتھ کچھ نہ لگا، مجھے ٹھیک یہ بھی یاد نہ تھا کہ سونے کے لئے لیٹتے وقت ہم نے کتنی میز کرسیاں وہاں دیکھی تھیں، لیکن اس وقت تو کمرہ میں صرف کرسیاں ہی کرسیاں دکھائی دے رہی تھیں، نہ جانے اتنی کرسیاں کمرہ میں کہاں سے آگئی تھیں، اگرچہ نظر ایک

نہ آئی تھی پھر بھی ہر مرتبہ میرا سر ایک نہ ایک کرسی سے ٹکراتا۔ اب صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور میں غصہ میں خوب بڑبڑایا۔

آخر کار میں نے جھنجھلا کر ننگے پیر ہی جانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنے اُس وقت کے اندازہ کے مطابق دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کھڑے ہو کر مجھے آئینہ میں، جو ٹوٹنے سے بچ گیا تھا، اپنا دھندلا سا عکس دکھائی دیا جسے دیکھ کر میں ڈر گیا، میں نے محسوس کیا جیسے میں بالکل کھو گیا ہوں اور مجھے مطلق خبر نہیں کہ میں کہاں اور کدھر ہوں میں پھر بیٹھ گیا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لئے ایک ایک کر کے ہر چیز کو چھونے لگا۔

اس کے بعد میں نے ایک بار پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی، نہ جانے کہاں سے کمبخت چھتری آگئی تھی جو اس زور سے زمین پر گری جیسے کسی نے پستول چھوڑ دیا۔ میں نے گھبرا کر دانتوں تلے جیب دبالی اور دم بخود رہ گیا۔ شکر ہے شاہد ٹس سے مس نہ ہُوا۔ میں نے چھتری کو انتہائی احتیاط کے ساتھ دیوار سے لگایا لیکن جیسے ہی میں نے ہاتھ ہٹایا اسی قسم کی آواز کے ساتھ وہ پھر نیچے آرہی، میں سکتہ کے عالم میں رہ گیا۔ میں خاموش کھڑا تھا اور میرے ساتھ کمرے کی ہر شے خاموش تھی۔ غنیمت ہے کہ اس مرتبہ کوئی نقصان نہیں ہوا، پھر بھی میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

اب میں نے دروازے تک پہنچنے کا دوسرا طریقہ ایجاد کیا۔ میں نے سوچا دیوار کے سہارے چل کر دروازے تک پہنچنا آسان ہو گا۔ بس ٹھیک ہے میں نے فوراً اس تجویز

کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ اس تجربے میں سب سے پہلے ایک تصویر کی قضا آئی جو اس زور سے فرش پر گری کہ تمام کمرہ گونج اُٹھا، مگر شکر ہے شاہد کو اب بھی جنبش نہ ہوئی۔ لیکن میں نے خیال کیا اگر میں اسی طرح تصویروں پر تجربے کرتا رہا تو ضرور شاہد کو جگا ڈالوں گا، اور اس کے بعد میں یہ طے کرنے پر مجبور ہو گیا کہ دروازہ کی تلاش ملتوی رکھی جائے۔

اب کیا کیا جائے! مایوس ہو کر میں نے پھر بستر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا، مجھے یقین تھا میں کسی ایسے مقام تک پہنچنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جسے بستر کی کھوج لگانے کے سلسلے میں محاذ بنایا جا سکے۔ بستر تک پہنچنے کے بعد پانی کا گھڑا ملنے کا یقین تھا جس سے پیاس بجھانے کی اُمید وابستہ تھی۔ میں نے پھر گھٹنوں کے بل سرکنا شروع کیا، کیونکہ یہ ایک آزمایا ہوا طریقہ تھا، اور یہی وہ طریقہ تھا جس کی مدد سے زیادہ سرعت اور اعتماد کے ساتھ میں آگے بڑھ سکتا تھا۔ آخر کار مجھے میز مل گئی۔ لیکن اس کامیابی کی مجھے یہ قیمت دینی پڑی کہ سر میں سخت چوٹ آئی۔ سر سہلاتا ہوا میں کھڑا ہو گیا، گپ اندھیرے میں میں نے جسم کو تولنے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے اور اُنگلیاں کھول دیں اور اس پوزیشن سے آگے بڑھنا شروع کیا، پھر مجھے ایک کرسی ملی، پھر دیوار، پھر ایک اور کرسی، پھر میں ایک صوفے سے ٹکرایا، پھر ایک دیوارگیری پر ہاتھ جا پڑا، پھر ایک دوسرا صوفا ہاتھ لگا۔ میں پریشان ہو گیا کیونکہ میرے خیال میں کمرے میں صرف ایک صوفا تھا۔ میں نے ہمت کر کے میز تک پہنچنے کی کوشش کو جاری رکھا۔ مگر دو چار کرسیوں کے علاوہ اس وقت میرے ہاتھ کچھ نہ لگا۔

اس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ چونکہ میز گول تھی اس لئے اُسے محاذ بنا کر مہم سر کرنا ایک غلط رائے تھی، اس لئے تازہ دم ہوکر میں ایک بار پھر چل کھڑا ہوا اور یونہی کرسیوں اور صوفوں کے ہولناک بھیانک بن کے درمیان نامعلوم خطوں میں گھومنے لگا۔ فوراً ایک موم بتی پھینکی جو کارنس پر رکھی ہوئی تھی، موم بتی کی تلاش میں ایک لیمپ گرا دیا، لیمپ کی جستجو میں ایک گھڑا پھوڑا جس سے بڑے سخت دھڑکے کی آواز پیدا ہوئی۔

"آخر کار میں نے تمہیں پا لیا"! میرا ظاہر ہے بستر سے ہو سکتا تھا" یقیناً میں اب تمہارے بہت نزدیک پہنچ گیا ہوں۔"

دوسری طرف شاہد چلایا "چور! چور! خون! خون! ارے میں ڈوبا! ارے کوئی بچاؤ!!"

گھڑے کے دھماکے سے سارا ہوٹل جاگ اُٹھا، ہوٹل کا مالک جو برابر کے کمرے میں سو رہا تھا ہاتھ میں ٹارچ لئے ننگ دھڑنگ نکل کھڑا ہوا۔ بتی لئے اس کا لڑکا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا، ایک ایک کرکے جلوس کی صورت میں لوگ کمرے میں داخل ہونے لگے یہاں تک کہ کمرہ بھر گیا۔ ہر شخص اپنے ساتھ روشنی بھی لایا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا، میں نے دیکھا میں شاہد کے بستر پر ہوں۔ کتنی طویل مسافت طے کی تھی میں نے! کمرے میں صرف ایک صوفا تھا جو دیوار سے لگا ہوا تھا اور صرف ایک کرسی تھی جس کو با آسانی حاصل کیا جا سکتا تھا، گویا میں سیاروں کی مانند اُسی ایک کرسی کے چاروں طرف چکر کاٹتا رہا اور "دم دار" ستارہ کی طرح

آدھی رات تک اسی ایک کرسی سے ٹکراتا رہا۔

پھر میں نے سب لوگوں کو بتایا کہ میں اپنا وقت کس طرح گذارتا رہا۔ اور کیوں؟ پھر ہوٹل والا اور اس کے ساتھی رخصت ہو گئے اور ہم دونوں صبح کے ناشتہ کی تیاری میں مشغول ہو گئے، کیونکہ اب پو پھٹ رہی تھی اور تڑکا ہونے والا تھا۔ میں نے "راہ پیما" پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا میں نے رات میں ۱۴ میل طے کئے تھے۔ لیکن اس کی مجھے پرواہ نہ تھی کیونکہ میں بہر حال پیدل سفر کے لئے گھر سے نکلا تھا۔

کھٹمل

دُنیا میں کون ہوگا جس نے برکھا رُت میں مست ہوکر ایک بار انگڑائی نہ لی ہو، اودی اودی گھٹائیں دیکھ کر کون سی ایسی زبان ہوگی جس نے پپیہے کے ساتھ "پی کہاں" کا موسمی راگ نہ الاپا ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا کر کون ایسا دل ہوگا جس میں گدگدی پیدا نہ ہوئی ہو۔ برسات کا موسم گویا موسموں کا سرتاج ہے لیکن برساتی خطرے بھی اپنی جگہ ضرب المثل بن گئے ہیں، کیچڑ، پھسلن، سانپ بچھو، ملیریا، ہیضہ اور سب سے بڑھ کر کھٹمل! یہ ہیں برساتی لعنتیں!

کہتے ہیں کہ کھٹملوں کی جتنی پیداوار برسات کے موسم میں ہوتی ہے اتنی سال کے کسی حصہ میں نہیں ہوتی۔ کیچڑ اور پھسلن سے انسان محفوظ رہ سکتا ہے بشرطیکہ گھر سے باہر نہ نکلے، سانپ بچھو روزمرہ کے نہیں ہوتے، اندھیرے اُجالے میں کبھی کبھار سابقہ پڑ ہی جائے تو لاٹھی سے، جوتے سے، یا پھر کم از کم بھاگ کر جان بچائی جاسکتی ہے ملیریا اور ہیضہ کے لئے سینکڑوں انجکشن اور دوائیاں ڈاکٹروں اور حکیموں نے

ایجاد کر ڈالی ہیں لیکن کھٹمل کا علاج آج تک کسی نے ایجاد نہیں کیا۔ مثل مشہور ہے "سانپ کا کاٹا سوئے اور بچھو کا کاٹا روئے" مگر کھٹمل کا کاٹا ان دونوں سے مختلف ہے اس میں نہ آدمی مرتا ہے اور نہ روتا ہے بلکہ صرف دیوانہ ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کسی نے کھٹمل کی شان میں ایک آدھ مثل بھی نہ گھڑی ورنہ یوں مشہور ہوتا "کھٹمل لاگے، سوتا جاگے نندیا بھاگے"

کھٹمل دو لفظوں "کھاٹ" اور "مال" سے مل کر بنا ہے۔ عرف عام میں کھاٹ نام ہے اُس چارپائی کا جو گھٹیا قسم کے موٹے موٹے بانّدوں سے بنی ہوئی ہو، جس کے پائے دیسی بڑھئی کے بنائے ہوئے ہوں اور جس میں پٹیاں اور سیرو سے بجائے سال کے بانس کے ڈالے گئے ہوں۔ "مال" لال رنگ کے اُن چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو کہتے ہیں جو ان چارپائیوں میں رہتے ہیں اور دن رات انسانوں کا خون چوستے ہیں، اسی اعتبار سے لوگوں نے ان کا نام "کھٹ مل" اور پورن مل" کے جوڑ پر "کھٹمل" رکھ دیا ہے۔ اب چونکہ دنیا نے کافی ترقی کر لی ہے اور لوگ نئے نئے ممالک دریافت کر چکے ہیں اور ہر قوم کو نوآبادیوں کی جستجو ہے، اس لئے کھٹملوں نے بھی اپنے پرانے مسکنوں کے علاوہ نئی بستیاں بسائی ہیں اور ہسپتال کے لوہے کی آہنی چارپائیوں، نواڑ کی بنی ہوئی مسہریوں، میز کرسیوں حتّیٰ کہ صوفوں میں بھی رہنا شروع کر دیا ہے۔ نوآبادیوں میں رہنے والے کھٹمل دیسی نہیں اینگلو انڈین قسم کے کھٹمل ہوتے ہیں اور انھیں آسانی کے لئے "کرسی مل" یا "صوفا مل" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر آپ کو کبھی رات بھر جاگنے کی ضرورت پیش آجائے تو آپ ایسا پلنگ تلاش کر لیں جس میں کھٹمل ہوں کھٹمل آپ کو جاگنے میں کافی مدد دیں گے۔ بعض شکاریوں کا خیال ہے کہ مچھلی اور ہرن کے شکار میں وہ لطف نہیں جو کھٹمل کے شکار میں ہے کھٹمل پکڑنے کے لئے نہ آپ کو صبر و انتظار کی ضرورت ہے اور نہ کہیں بھاگ دوڑ کرنے کی وہیں بستر پر آرام سے لیٹے لیٹے تماشا دیکھئے پلک جھپکتے ہی دو تین آپ کی پیٹھ کے نیچے آجائیں گے۔ اس طرح گھنٹہ بھر میں کچھ نہیں تو آپ ساٹھ ستر کھٹمل مار لیں گے۔ آپ کی پیٹھ وہی کام کرے گی جو مچھلی کے شکار میں بنسی کا کانٹا انجام دیتے ہیں یعنی جس طرح چارے کے لالچ میں بڑی مچھلیاں کانٹے میں آپھنستی ہیں اسی طرح آپ کی پیٹھ کے مزے دار خون کی چاشنی کھٹملوں کو کشاں کشاں چارپائی کی دور دور کی چولوں سے کھینچ لائے گی اور آپ کو شکار کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ بے بچھونے کے پلنگ پر نہ لیٹنا چاہئے اس صورت میں شکار تو کافی ہاتھ آئے گا لیکن حالات منقلب ہو جائیں گے یعنی پہلے آپ شکاری تھے تو اب خود شکار بن جائیں گے۔

بدبو میں کوئی کیڑا کھٹمل کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس کی بدبو بھی خاص قسم کی ہوتی ہے جو دور سے پہچانی جا سکتی ہے کسی مقابلہ کے امتحان میں اگر دس بدبوئیں سونگھنے کو دی جائیں تو کھٹمل کی بدبو صاف پہچانی جا سکتی ہے۔ برسات کے موسم میں شمع پر جان دینے والے کیڑوں میں ایک بدبو والا کیڑا بھی ہوتا ہے بس اس کیڑے کی بو باس کچھ کھٹمل سے مشابہ ہوتی ہے اس لئے لوگ اس کا اصلی نام نہیں جانتے اور اسے کھٹمل کی

بدبو والا کیڑا کہتے ہیں، یہ بدبو ان کھٹملوں میں تیز تر ہوتی ہے جو کئی کئی دن کے بھوکے ہوتے ہیں اور جن میں نہ خون ہوتا ہے نہ ہڈی پسلی، نہ رنگ روپ، اور نہ کس بل، ان میں بس بدبو ہوتی ہے اور کچھ نہیں، ان کھٹملوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اُن کا ڈنک بہت تیز ہوتا ہے اُن کے کاٹنے سے انسان یکایک اچھل پڑتا ہے، اوّل تو اس قسم کے کھٹمل کا پکڑنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ جان بچانے کی آخری کوشش میں وہ دُم دباکر اس طرح بھاگتا ہے کہ تعاقب میں واقعی دقت ہوتی ہے، اور اگر ہاتھ آجائے تو مار کر کوئی لطف نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بڈھے کا گلا گھونٹ دیا، کم بخت سخت جان اتنا ہوتا ہے کہ آپ اسے جوتی سے کتنا ہی مسلیں، اس پر کوئی اثر نہ ہوگا، بہت دیر میں دم توڑے گا تو بے کھبری پوری کی طرح بچا ہو کر خستہ کھٹمل دیکھنا ہو تو کسی موٹے تازے کھٹمل کو پکڑ کر لیمپ کی بالائی منزل پر چھوڑ دیجئے جل بھن کر آنکھوں میں نمک پارہ کی طرح کُرکُرا ہو جائے گا۔

نادر شاہی قتلِ عام کی جھلک دیکھنی ہو تو ایک دن چارپائیوں کو دھوپ میں ڈال دیجئے لیکن دھوپ خوب کڑاکے کی ہونی چاہئے جیسی عام طور پر برسات کے موسم میں ہوتی ہے، پھر ایک دفعہ چارپائی کو کوئی گز بھر اوپر اٹھا کر زور سے زمین پر دے ماریئے، کھٹملوں کی وہ بوچھار ہوگی جیسی کسی سخت آندھی میں آموں کی ہوتی ہے۔ اس اچانک یلغار سے کھٹملوں کی پرسکون بستی میں تلاطم پیدا ہو جائے گا، اس موقعہ پر آپ کو جوابی حملہ کے لئے تیار رہنا چاہئے کیونکہ ان کا جوابی حملہ نہایت خطرناک ہوتا ہے، اور

تنہا آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بعض کھٹمل جو فنِ جنگ کے ماہر ہوتے ہیں کبھی آپ کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ اس لئے آپ کو کئی کئی بار حملہ کرنا ہوگا اور کئی آدمیوں کو ساتھ لے کر لڑنا ہوگا۔ اس طرح کیل کانٹے سے تیار ہو کر آپ لڑیں گے تو مقابلہ برابر کا ہوگا تمام زمین چشم زدن میں ترنم خون ہو جائے گی، کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگ جائیں گے، ان لاشوں کو اٹھانے کے لئے فوراً چیونٹیاں آ پہنچیں گی اور کھٹملوں کے خالی چھلکوں کو پیٹھ پر لاد کر لے جانا شروع کر دیں گی۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ کھٹمل ہمارے مقابلہ میں ایک بے حقیقت شے ہے، لیکن جب اس کا داؤ چلتا ہے تو ہمیں عاجز کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے جتنے بہادر ہم ہیں اتنا ہی وہ ہے لیکن ہمارے اور اس کے طرزِ جنگ میں بڑا فرق ہے، ہم براہِ راست حملہ کرتے ہیں وہ چپکے سے پشت کی طرف سے وار کرتا ہے، ہم دو بدو اور دست بدست لڑائی کے قائل ہیں، وہ شب خون مارتا ہے ہم کھلے میدان میں لڑنا پسند کرتے ہیں، وہ گوریلا داؤ پیچ استعمال کرتا ہے غرض یہ کہ وہ بہمہ اوصاف "سرخ" ہے اور ہم ہیں اور اس میں نسلی امتیاز کے علاوہ کوئی فرق نہیں، ہم اپنے انسان ہونے پر فخر کر سکتے ہیں تو وہ اپنے کھٹمل ہونے پر ناز کرتا ہے۔ بے شک ہم انسان ہیں لیکن ہم کھٹمل بہر حال نہیں ہو سکتے بالکل اسی طرح وہ بھی صرف کھٹمل ہے اور انسان نہیں ہے، پھر ہمارا طرۂ امتیاز آخر کیا ہے، یہی نا کہ ہم اس کی جان لے سکتے ہیں، اس کے خاندان کے خاندان تباہ کر سکتے ہیں، اس کی بستیاں کی بستیاں اجاڑ سکتے ہیں بے زبان اپنے

دل میں کہتا ہوگا یہ تو سیزر اور سکندر نے بھی کیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ کھٹمل کے وجود نے ان امتیازات کو فنا کر کے رکھ دیا ہے جن کی بنیادیں دولت کی کمی اور سرمایہ کی زیادتی پر قایم ہیں، اس کے نزدیک امیر غریب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس معاملہ میں اقتصادی مساوات کا قائل ہے اس کا معیار بلند ہے اور انتخاب منصفانہ، دولت کی کمی اُسے متاثر کرسکتی ہے لیکن زیادتی سے وہ ہمیشہ متنفر رہتا ہے کبھی کبھی تو وہ غریبوں کا مخلص بن کر خود انتقام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ غریب اس کی خاطر کرتے ہیں اور وہ اُن کی خدمت میں دن رات لگا رہتا ہے کیونکہ جس کھاٹ پر غریب خراٹے کر رات بھر سکھ کی نیند سو سکتا ہے اس پر امیر پانچ منٹ بیٹھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔

دوسری عالمگیر جنگ ختم ہونے کے بعد کوشش کی جارہی ہے کہ دنیا کی قوموں میں میل ملاپ قایم کیا جائے مختلف مُلکوں کے بڑے بڑے لیڈر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور امن وصلح کی تجاویز پر غور کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب تک انسانوں اور کھٹملوں کے نمایندوں کی کوئی متحدہ کانفرنس منعقد نہیں کی گئی، اُن کے تعلقات اب تک کشیدہ چلے جاتے ہیں اور وہ اکثر برسر پیکار رہتے ہیں یہ طرز عمل دنیا کے امن کے لئے سخت مضر ہے، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آپس میں میل جول پیدا کیا جائے نہ انسان کھٹمل کو ماریں، اور نہ کھٹمل انسان کو ستائیں، کھٹمل آزادی کے ساتھ چارپائیوں میں رہیں، لیکن اُنھیں چاہئے کہ "رہو اور رہنے دو" کے اصول پر عمل کریں۔

کھٹملوں کی طرف سے اس پیش کش کا کیا ردِ عمل ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کھٹملوں نے بہت جلد اپنی پالیسی کو نہ بدلا تو ایٹم کی طاقت پر گھمنڈ کرنے والا انسان ان کو تباہ کرنے میں کسر نہ اُٹھا رکھے گا۔

روزہ دار

"دار" لفظ نہیں بہروپیہ ہے جو معنی خیز خاصیتیں رکھتا ہے، اور نت نئے رنگ بدلتا رہتا ہے، ایک وہ "دار" جو اکیلا رہنے کا عادی ہے اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے، انا الحق کا دعوے دار اسی دار پر چڑھایا گیا تھا، دوسرے وہ "دار" جو ساتھیوں کی جلو میں چلنا پسند کرتا ہے' یہ عربی النسل ہے' اور "دار المحن" اور "دار العلم" کو اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ایک فارسی "دار" بھی ہے جو عربی "داروں" سے مختلف ہے لیکن ہندوستان آ کر اس کی عادتیں اور مزاج سب بدل گئے۔ نت نئے ساتھی ملے اور نیا نیا ماحول، ہندوستانی تو بن گیا مگر کسی سے دب کر نہیں رہا۔ وطن میں ساتھیوں کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی تھا، یہاں آ کر اکڑ کر چلنے لگا اور ساتھیوں کو پیچھے دھکیل آگے بڑھ گیا۔ یہ خود اس کا زور تھا یا ساتھیوں کی کمزوری، اس کی گواہی "تھانہ دار" اور "پہرہ دار" دیں گے۔ نسلی

اعتبار سے روزہ دار بھی انھیں کا مجازی شبد ہے لیکن قومیت کے لحاظ سے اس کی شان انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستانی ..... داروں" اور ہندوستانی روزہ داروں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے مثال کے طور پر تھانہ دار اور پہرہ دار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھیں، البتہ ہر روزہ دار بہ یک وقت پہرہ دار، تھانہ دار اور وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس میں لفظ پیچھے اور "دار" آگے ہو۔

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے ویسے تو ہندوستان کی ۲۵ فی صدی آبادی پر روزہ فرض کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس میں سے رکھنے والوں کی تعداد گھٹ کر کوئی ۵ فی صدی یا اس سے بھی کم رہ گئی ہے گویا باقی لوگوں پر روزہ معاف ہے۔ اگر معاف کیا نہیں گیا ہے تو انھوں نے خود معاف کر لیا ہے، بہر حال روزہ داروں کی تعداد میں روز بروز کمی آتی جا رہی ہے، اس کے کئی سبب ہیں، گرمی کا موسم، چلچلاتی دھوپ، پہاڑ جیسا دن، تن بدن میں آگ، چوٹی سے ایڑی تک پسینہ، پیاس کی شدت، اور نہ جانے کیا کیا، اس کے علاوہ رمضان میں بہت سی متعدی قسم کی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔ نزلہ، زکام اور کھانسی تو خیر عام ہو جاتے ہیں، لیکن بعضوں کو دردِ سر اور دردِ گردہ کی شکایت بھی ہونے لگتی ہے، کچھ لوگ عذر کرتے ہیں، روزے رکھے وہ جس کے پاس گھی دودھ کھانے کو پیسے ہوں۔ کسی پر روزہ اس لئے معاف ہوتا ہے کہ اس کے پاس ٹائم پیس نہیں جس کی مدد سے وہ سحر کو اٹھ سکے۔ لیکن

جانکار لوگوں کا خیال ہے کہ ان تمام باتوں کی جڑ ایمان کی کمزوری ہے۔

جس طرح روزہ دار کے حروف ایک دوسرے سے جدا ہیں، اسی طرح قسم کے اعتبار سے تمام روزہ دار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض روزہ دار عادتاً صرف روزہ دار ہوتے ہیں نمازی نہیں ہوتے اُن کا کہنا ہے کہ روزہ اور نماز علیحٰدہ علیحٰدہ عبادتیں ہیں۔ روزہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے روزہ بے جھول رہتا ہے لیکن بعض کی رائے میں نماز نہ پڑھنے سے روزہ ٹوٹتا نہیں، البتہ جھول ضرور ہو جاتا ہے کچھ روزہ دار "خاموشی زر ہے" کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں تو کچھ گویائی سیم ہے" کو لقب العین قرار دیتے ہیں۔ بعض روزہ نہیں رکھتے اللہ اور اس کے بندوں پر احسان کرتے ہیں۔ مزاج کے خلاف ذرا ذرا سی بات پر گھر والوں اور اڑوس پڑوس سے جھگڑا مول لینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور بہت سے تو ریل گاڑی کے اس زریں اصول کو بھول بیٹھتے ہیں جس میں بالخصوص مسافروں کو اور بالعموم ہر شخص کو (اور اس میں روزہ دار کا بھی کوئی استثنا نہیں) یہ ہدایت کی گئی ہے "تھوکو مت اس سے بیماری پھیلتی ہے"

رمضان کی صبح، عید کی شام کی طرح بے رونق اور اداس ہوتی ہے، رمضان کا دن، رات میں، اور رات، دن میں تبدیل ہو جاتے ہیں، کیونکہ روزہ دار دن میں سونا اور رات میں جاگنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اصل میں وہ دن میں بھی سوتے نہیں سینے کا نام کرتے ہیں اُن کے لئے خواب و بیداری ہم معنی بن جاتی ہیں۔ روزہ داروں کے

سونے، اونگھنے یا جاگنے کی حالت میں روزہ خوروں کا فرض رہتا ہے کہ خود نہ سوئیں بلکہ روزہ داروں کو سُلائیں یا دوسرے لفظوں میں کوّے ہانکیں۔

البتہ رمضان کی شام اور عید کی صبح، رمضان کی صبح اور عید کی شام کا جواب ہوتی ہے۔ عید کی صبح "صبح بنارس" کی طرح شگفتہ اور رمضان کی شام "شامِ اودھ" کے مانند پرکیف و پُربہار ہوتی ہے۔ رمضان میں شام کو روزہ دار طرح طرح کی افطاریاں کھاتے ہیں اور عید کی صبح کو نہا دھو کر نئے نئے کپڑے پہنتے ہیں لیکن روزہ خوران تمام نعمتوں سے محروم رہتے ہیں وہ روزہ داروں کا منہ تکتے ہیں، خونِ جگر پیتے ہیں اور روزہ کھاتے ہیں۔

کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ دار عام طور پر نیت خراب ہو جاتے ہیں افطار سے قبل روزہ داروں کی مد جو اسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، کھانے پہ گریں گے تو تین دن کی غذا پیٹ میں ڈال لیں گے، پینے پر اُتریں گے تو پیٹ کو مٹکا بنا لیں گے اور رات بھر ڈکاریں لیا کریں گے حقّہ کے شوقین اس زور سے سلفہ کھینچیں گے کہ حقّہ کے کشوں پر دو آتشہ کے گھونٹوں کا شبہ ہونے لگے گا۔

روزہ داروں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ بہت سے روزہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر روزہ کھولنا پسند کرتے ہیں اور جب بہت سے روزہ دار ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو آپس میں اس قسم کی بات چیت کرنے لگتے ہیں ایک کہتا ہے "اوہ اکس قدر سخت گرمی ہے"، دوسرا گویا ہوتا ہے "آج پیاس زیادہ رہی"۔ تیسرا ٹانگ اڑاتا ہے

"آج کا روزہ سخت گذرا" چوتھا راگ دیتا ہے "بارش کی سخت ضرورت ہے" رند مشرب بول اُٹھتا ہے "اگر یہی لیل و نہار ہیں تو بندہ کا کل سے استعفا" مولوی صاحب فرماتے ہیں کفر کفر! روزہ فرض ہے"

اس گھر سے بچنا چاہیئے جس میں میاں بیوی دونوں روزہ سے ہوں، ذرا سی بات میں سارے محلہ کو سر پر اٹھالیں۔ آن کی آن میں گھر کی چہار دیواری کو پانی پت کا میدان بنا دیں معمولی سی شکایت پر میاں بیوی ایک دوسرے سے روٹھ بیٹھیں۔ ایک دوسرا منظر ملاحظہ ہو، بیوی کی آنکھیں سوجی ہیں، میاں کا مُنھ پھولا ہے، ایک طرف بیوی جلی بھُنی گُھڑی بنی پلنگ پر پڑی ہیں، دوسری طرف میاں جلا ہوا حقہ بے گیتے میں کھڑے ہیں۔ یا پھر، بیوی میکے جانے کی تیاری میں مصروف ہیں اور میاں پردیس بھاگنے کے لئے بستر باندھنے میں مشغول ہیں۔ لیکن یاد رکھئے جانے والا دونوں میں سے ایک بھی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے دونوں گھر چھوڑ دیں اور میاں محلہ والوں اور بی بی پڑوسنوں سے لڑنے کے لئے نکل جائیں لیکن افطار تک روٹھے ہوئے ضرور مل جائینگے نہ بی بی میکہ جائیں گی، نہ میاں پردیس، کیسے اور کیونکر منیں گے یہ میاں جانیں یا بی بی۔

روزہ داروں کی طرح روزہ کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک روزہ ایک ڈاڑھ کا ہوتا ہے۔ اس میں دوسری ڈاڑھ سے کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے، اسے

اکثر بچے رکھتے ہیں یا وہ بوڑھے اور جوان رکھتے ہیں جو ظاہر میں روزہ دار اور اصل میں روزہ خور ہوں۔ وہ بھی روزہ ہی ہوتا ہے جس سے ملکوں کو آزادی مل جاتی ہے۔ جیل جانے والے ستیہ گرہی اُسے "مرن برت" کہتے ہیں ۔ اس میں اور عام روزہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اس کا رکھنے والا عُرفِ عام میں روزہ دار نہیں "لیڈر" کہلاتا ہے۔

علمِ لدنی رکھنے والے کہتے ہیں روزہ مفید ہے۔ جس طرح سال کے سال مشینوں کی صفائی کی جاتی ہے اور انھیں تیل دیا جاتا ہے اسی طرح جسمِ انسانی کی مشین کو جہاد بالنفس کے ذریعہ صاف کیا جاتا ہے اور روحانیت کا تیل دیا جاتا ہے ممکن ہے اس قول میں سچائی کا بھی کوئی پہلو ہو لیکن روزہ دار کا تجربہ بہر حال اس کے خلاف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ روزہ دار کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس سے بیٹھے کو کہئے کھڑا ہو جائے گا، ہنسانے کی کوشش کیجئے رو دے گا۔ کام لیجئے سو جائے گا، بات کیجئے پھاڑ کھائے گا۔ اس کا قول تھیہ ہے کہ روزہ میں نیند اُڑ جاتی ہے، عقل کٹ جاتی ہے، معدہ سڑ جاتا ہے، وزن گھٹ جاتا ہے، وہ روزہ کی افادیت پر ایمان نہیں رکھتا، اس کے نزدیک روزہ فرض ہے وہ روزہ رکھ کر کسی پر احسان نہیں کرتا اپنا فرض ادا کرتا ہے، وہ عبادت برائے عبادت کا قائل ہے۔ عبادت برائے جنت کا قائل نہیں۔

ٹخ ٹخ! ہلا ہلا!

گاڑی کو اپنی آنکھوں سے پلیٹ فارم پر کھڑا دیکھ لیا تب جان میں جان آئی۔

معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہی ہے۔ میری گھڑی اگرچہ ریل کے گھنٹے سے پانچ منٹ تیز تھی لیکن گاڑی چھوٹنے کا وقت اسٹیشن کے گھنٹے کے مطابق بھی ہو چکا تھا، اپنی گاڑی کو موجود پا کر مجھے جتنی خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ دراصل ہمیں شہر میں دیر ہو گئی، سامان کافی خریدنا تھا اور ہم دو آدمی —— میں اور میرا ساتھی۔ اگر الگ الگ ہو کر شاپنگ کرتے تو وقت میں کفایت ہو جاتی، مگر یہ ناممکن تھا، نہ میں بغیر ساتھی کے مشورے کے کچھ خرید سکتا تھا اور نہ میرا ساتھی بغیر میری صلاح کے۔ کل چھ گھنٹے ہمارے پاس تھے چنانچہ خرید و فروخت سے فارغ ہو کر جب ہم نے اسٹیشن کے لیے تانگہ پکڑا تو گاڑی چھوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔

میرا ساتھی فطرتاً تاخیر پسند واقع ہوا ہے، دیر سے سوتا ہے، دیر سے اُٹھتا ہے، اور دیر سے اسٹیشن پہنچتا ہے، اس کے برعکس میں خاص کر ریل کے معاملہ میں انتہائی عجلت پسند واقع ہوا ہوں، چنانچہ وہ جتنا مطمئن نظر آتا تھا، میں اتنا ہی پریشان اور حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اس کے اطمینان پر کبھی کبھی مجھے غصہ بھی آتا تھا، اور اب چونکہ گاڑی موجود تھی اس لئے اس کا اطمینان میرے واسطے مستقل طنز بن گیا تھا۔

مجھے دراصل اندیشہ یہ تھا کہ اگر یہ گاڑی جو چار بجے پر چھوٹتی ہے اور جسے ہم لوکل ٹرمبے کے مقابلہ میں ڈاک گاڑی کہا کرتے ہیں، نہ ملی تو ہمیں علاوہ اسٹیشن پر دو گھنٹے بے کار پڑے رہنے کے اس منحوس ٹرمبے سے سفر کرنا پڑے گا جس سے مجھے نفرت ہے۔

"ٹرمبا" اس علاقے میں اس چھکڑے کو کہتے ہیں جو رفتار کے اعتبار سے بالکل اونٹ گاڑی کے مشابہ ہے۔ اس کا انجن جس کی سیٹی پر گدھے کے رینکنے کا شبہ ہوا کرتا ہے اور جو قد و قامت میں کینیڈا کے نئے انجنوں کی اولاد معلوم ہوتا ہے، معمولی نزلہ اور زکام کی شکایت پر کہیں بھی ٹھپ ہو سکتا ہے، اور گاڑی کو تین گھنٹے لیٹ کر سکتا ہے۔ اسٹیشن تو اسٹیشن ہر حالت پر رُکتا ہوا جاتا ہے، اور آدھ گھنٹے کا مختصر سفر اس بُری طرح ڈیڑھ گھنٹے میں پورا کرتا ہے کہ آئندہ سفر کرنے سے کان پکڑنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے، چلتے اور رکتے وقت کتنوں کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں، کتنے بچے ماؤں کی گود سے گر جاتے ہیں، اور جتنی دیر سفر کیجیے چرخ چوں کی سُریلی آوازیں متواتر کانوں میں اس طرح گھولتی ہیں کہ سر میں درد

ہونے لگتا ہے۔ سفر گویا وبالِ جان بن جاتا ہے۔

اس صورت میں ہم اپنی گاڑی کو کھڑا ہوا پا کر اطمینان کا سانس کیوں کر نہ لیتے؟ لپاک جھپاک ٹکٹ خریدے جلدی میں پُل کی بجائے لائن پار کرکے بھاگم بھاگ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر پہنچے جس پر گاڑی کھڑی تھی اور تیزی سے ایسا ڈبہ تلاش کرنے لگے جس میں دو عدد مسافروں کی جگہ نکل آئے۔

یہ گاڑی عام طور پر خالی جانے کی عادی ہے لیکن آج چونکہ ہمیں سفر کرنا تھا اور اسٹیشن بھی دیر سے پہنچا تھا اس لئے آج یہ عمداً کھچا کھچ بھری ہوئی تھی —— تھرڈ —— تھرڈ —— تھرڈ —— مسلسل تھرڈ کے ڈبوں نے ناک میں دم کر دیا۔ سکنڈ —— یعنی معمولی سکنڈ —— ایک بھی دکھائی نہ دیا، میں غصے سے سُلگ اُٹھا اور دل ہی دل میں ریلوے والوں کو کوسنے لگا۔ آخر یہ تیسرے درجے کے اتنے ڈبوں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سکنڈ کے ڈبے اتنے پیچھے کیوں لگائے جاتے ہیں کہ ان تک پہنچنے میں اتنی دیر لگتی ہے۔؟

بڑی مشکل سے سکنڈ نظر آیا مگر اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دوسرے کا بھی یہی حال تھا۔ تیسرا کچھ خالی خالی تھا مگر وہ زنانہ نکلا۔ "یہ آخر زنانے ڈبے کے علیحدہ ہونے کی کب تک ضرورت پیش آتی رہے گی؟" میں نے اپنے دل میں کہا۔ کم از کم آزادی کے بعد تو اس قسم کی قدامت پرستی کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ اب تو تمام ان اداروں کو جن سے رجعت کی ذرا بھی بو آتی ہو بے سمجھے سوچے ختم کر دینے کی ضرورت ہے

اب ہندوستان کی سوئی ہوئی قسمت جاگ چکی ہے۔ قدم قدم پر انقلاب انگڑائیاں لے رہا ہے، نت نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ہر آنے والا لمحہ اپنے دامن میں انقلاب کا کوئی نہ کوئی پہلو چھپائے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والے سالوں میں کیا سے کیا ہونے والا ہے، چیزوں کے نام کھٹا کھٹ تیزی کے ساتھ بدلے جا رہے ہیں، صوبوں سڑکوں، پارکوں، پبلک عمارتوں اور قومی اداروں کے نام سب بدلے جا چکے ہیں، اور اب یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل میرا نام گھسیٹا اور میرے ساتھی کا سیٹھ برلا نہیں ہو سکتا۔

ناموں کی اس لوٹ پھیر کے سلسلے میں جتنی زحمت اس بے چارے "انٹر" کو برداشت کرنی پڑی ہے اتنی اور کسی کو نہیں۔ اچھے خاصے انٹر سے یک لخت ترقی کر کے سکنڈ کے درجہ تک پہنچ گیا۔ شامتِ اعمال سے کچھ دنوں خوب اکڑ کر چلا، اور اسی قصور کی پاداش میں شاید اس کا تنزل کر دیا گیا، اور معمولی سکنڈ کہلانے لگا۔ اب سنتے ہیں کسی نئے قصور پر پھر "اپنے قرینے" پر آنے والا ہے، نام کی اس معمولی رد و بدل میں یار لوگوں کا مقصد حاصل ہو ہی گیا۔ سرکار کو اس سلسلے میں تین چار کروڑ کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ چک اچک! اہاہا!!

جگہ کی تلاش میں ہم اور آگے بڑھے۔ معمولی سکنڈ کے بعد فرسٹ اور اصلی سکنڈ کے ڈبے لگے ہوئے تھے، اور اس کے بعد گارڈ کا ڈبہ تھا، اور آگے بڑھے تو دو تین ڈبے اور جڑے ہوئے ملے جن میں دو تھرڈ کے اور ایک ہر دو سکنڈوں کے تھے۔ معلوم

ہوتا تھا کہ یہ ڈبّے کسی ۳۹ سنہ سے پہلے والی گاڑی کے ڈبّے ہیں جو بھولے بھٹکے یہاں آ لگے ہیں۔ کیوں کہ ان میں دو دو چار مسافر اس طرح بیٹھے تھے جیسے انھیں کہیں جانا ہی نہیں ہے اور یہی اُن کا گھر ہے، میں نے اپنے ساتھی کو پہلے اتنی عمدہ جگہ حاصل کرنے پر مبارک باد دی اور پھر سوچنے لگا کہ یہ ڈبّے چونکہ سب سے پیچھے لگے ہیں، اس لئے مسافروں کی نظر سے محفوظ رہے۔ فوراً ہی ہم نے دیکھا کہ چند مسافر ہماری دیکھا دیکھی ان پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ہمیں اُن پر سبقت لینی دشوار ہوگئی، اس لئے اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ذراسی دیر میں کہیں یہ بھی اتنے ہی نہ بھر جائیں، ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے سامان رکھ کر جگہ گھیر دی جائے۔

خوش قسمتی سے یہ آنے والے نہ جانے کیوں خود بخود لوٹ گئے، ہم نے اطمینان کا سانس لیا، آرام سے سامان لگایا اور سیٹ رکھ کر سیٹوں کو ریزرو کر دیا ......

آج کوئی بھی خواہش کرتے تو پوری ہو جاتی۔ ہمیں گاڑی پکڑنے پر خوشی سے زیادہ اس بات پر فخر ہو رہا تھا کہ ہم نے اتنی عمدہ جگہ حاصل کی، خوش قسمتی کے اس نادر شاہکار پر میری رُوح کو تقویت پہنچ رہی تھی، لیکن ہمارے سیکڑوں بھائی بہن دوسرے ڈبوں میں اس طرح بیٹھے تھے جیسے کائن ہاؤس میں گائیں بھینسیں، جہاں عجب نہیں تھا کہ ایک آدھ دم گھٹ کر جاں بحق تسلیم ہو جائے۔ اس تصوّر سے مجھے اپنی کامیابی ہیچ معلوم ہونے لگی۔ اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان میں سے کم از کم دو چار کو ادھر ضرور کھینچ بلاؤں، اور اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں ایسا کرنے سے باز نہ آتا۔ آج

ہماری طرح کوئی دیر سے آنے والا جان پہچان، جگہ کا متلاشی بھی ہاتھ نہ لگا جسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دیتا اور اتنی اچھی جگہ حاصل کرنے پر اپنی غیر متوقع کامیابی کی داد حاصل کرتا۔ میں سوچنے لگا اگر یہ دو چار مسافر جو ڈبے پر ہم سے پہلے قبضہ کر چکے تھے موجود نہ ہوتے تو ہمارا سفر کتنا پھیکا اور اُداس ہو جاتا۔

ریل گاڑی بچاری کی بھی مصیبت میں جان ہے۔ کس کس کی فرمائش پوری کرے اور کس کس کا کہا مانے؟ گاڑی بھری ہو تو مشکل خالی ہو تو مشکل! بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ خالی گاڑی اُداس معلوم ہونے لگے! مجھے رہ رہ کر اس سے بھی وحشت ہو رہی تھی کہ ہمارے ڈبے کے آگے نہ وہ چہل پہل تھی، نہ بھیڑ بھاڑ، نہ قلیوں کی چیخ پکار، نہ خوانچہ والوں کی پھیکی پھیکی جھوجھری آوازیں، جو چھوٹنے والی گاڑی کے سامنے عام طور پر سننے میں آیا کرتی ہیں۔ میں دل ہی دل میں جلنے لگا۔ میرا ساتھی دن بھر کا بھوکا تھا۔ اس لئے وہ کھانے پینے کی تلاش میں آگے جا کر کسی خوانچہ والے سے سودا چکانے لگا، اس میں شاید یہ مصلحت ہو گی کہ اگر کہیں گاڑی چھوٹ جائے تو پچھلے ڈبے کو آسانی سے بھاگ کر پکڑا جا سکے۔ میرا ساتھی چلتی گاڑی میں بیٹھنے کا شوقین ہے۔ بہ خلاف اس کے مجھے چلتی گاڑی میں سوار ہونے سے نفرت ہے۔ میں چلتی گاڑی میں بیٹھنے پر گاڑی چھوڑنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

ساتھی کے چلے جانے کے بعد میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے ڈبے کا دروازہ کھولا کیونکہ اب جگہ گھِر جانے کا امکان جاتا رہا تھا اور اطمینان سے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

جیب سے سگرٹ نکال کر جلایا اور مزے لے لے کر دھواں اُڑانے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی کے دونوں سروں پر انجن جڑے ہیں جن میں سے ایک اسے پچھم کی طرف اور دوسرا پورب کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ہماری گاڑی پچھم کی طرف جانے والی تھی مگر کسی طرح چھوٹنے میں نہ آ رہی تھی۔ اگر ہمارے اسٹیشن پہنچنے سے پہلے کہیں گاڑی چھوٹ گئی ہوتی تو اسٹیشن کے عملہ کی جان مصیبت میں آجاتی، نہ جانے کتنی خاموش گالیاں اُن بیچاروں پر پڑتیں اور اب چونکہ ہمیں گاڑی مل چکی تھی، اس لئے اب گاڑی چھوٹنے میں اتنی دیر لگنے پر وہ بے چارے گالیاں کھا رہے تھے۔ یہ گاڑیاں آخر لیٹ کیوں ہوتی ہیں؟ خواہ مخواہ وقت خراب کرتی ہیں، اور اب تو بعض گاڑیوں نے یہ فیشن اختیار کر رکھا ہے کہ اتنی لیٹ ہوتی ہیں کہ بالکل لیٹ رہتی ہیں یعنی بعض اوقات ۱۷ اپریل کو شام کو پانچ بجے چھوٹنے والی گاڑی چوبیس گھنٹے لیٹ ہونے کے بعد ۱۸ اپریل کو پانچ بجکر دس منٹ پر چھوٹتی ہے۔ میں اسی طرح کے خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ یک لخت گارڈ کی کرخت سیٹی نے کان کے پردے پھاڑ دیئے۔ میں نے مڑ کر انجن کی طرف نظر دوڑائی اور میری آنکھیں ساتھی کو ڈھونڈھنے لگیں جو دور کہیں انجن کے آس پاس کسی دوسرے خوانچہ والے سے پھل خرید رہا تھا۔ اب گاڑی بس چھوٹنے والی تھی۔

"آداب عرض"! اچانک مجھے ایک اجنبی کی مانوس آواز نے چونکا دیا۔ "آداب" کے دونوں الفاظ کو کچھ اس طرح کھینچ کر ادا کیا گیا تھا کہ خواہ مخواہ متوجہ ہونا پڑا۔

"سعید ب ــــــــ تم ب ــــــــ تم! ــــــــ" میں فرطِ خوشی میں گاڑی سے نیچے اُتر پڑا، اس نے اس قدر جھٹک کر ہاتھ ملایا کہ میری کلائی میں جھٹکا آگیا، چار مہینے کے بعد اس طرح اچانک اُس سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

"مٹھائی کھلاؤ۔ تمہارا کام ہو گیا" اس نے خوشخبری سنائی۔ اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس بنچ کی طرف لے جانے لگا جو ڈبّے کے سامنے چار یا پانچ قدم کے فاصلہ پر پڑی تھی اور جس پر وہ پہلے سے بیٹھا تھا۔

"سچ!" میں نے خوشی سے جھوم کر بنچ کی طرف جانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ گارڈ صاحب جیسے سیٹی بجا کر سب گئے اور مجھے سعید سے باتیں کرنے کا اچھا موقع مل گیا، میں اس خبر کی تفصیلات جاننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ لیکن بہر صورت میں اپنی گاڑی چھوڑنے کی قیمت دے کر ٹربے کی مصیبت مول لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے بات کر لیں لیکن گارڈ کی اس برمحل خاموشی سے ہم نے فائدہ اُٹھا لیا اور میں اور سعید سامنے والی بنچ پر جا بیٹھے۔

سعید لکھنؤ سکریٹریٹ میں ہیڈ کلرک ہے اور میری تنخواہ کے اضافہ کا معاملہ اسی سے وابستہ تھا جس کے لئے میں پچھلے چھ مہینے سے برابر سرگرداں تھا، اور جس کی خاطر میں نے اس سے دوستی کی تھی۔

میں نے کہا۔ "مٹھائی تو پکی ہو گئی مگر یہ تو بتاؤ آخر یہ کیسے ممکن ہو سکا؟"

میں نے تفصیلات جاننے کے لئے استفسار کیا۔

"اب یہ سب پوچھ کر کیا کرو گے"؟ اس نے منشیانہ متانت کے ساتھ میری بے چینی کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا اور گارڈ نے دوسری سیٹی بجا کر کان کے پردے پھاڑ دیئے، اس پر میں اور گھبرا گیا۔

"گھبراتے کیوں ہو، ابھی گاڑی نہیں چھوٹے گی" سعید نے میری بدحواسی کو تاڑ کر بڑے اطمینان سے کہا، وہ خود شاید اس لئے مطمئن تھا کہ اس کی گاڑی تقریباً ایک گھنٹے بعد چھوٹنے والی تھی۔

"آخر ہوا کیا؟" میں نے پھر یاد دلایا اور میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر اوّل اُسے پیش کیا اور ایک اپنے منہ میں لگایا، پھر دیا سلائی گھس کر پہلے اس کا سلگایا پھر اپنا۔ سگرٹ کی رشوت پا کر وہ میرے سوال کا جواب دینے پر مجبور سا ہو گیا۔

"بس ہوا کیا" اس نے دھواں اُڑاتے ہوئے لاپرواہی سے کہنا شروع کیا" میں نے تمہارے موافق نوٹ لکھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کی تصدیق کر دی، اور سکریٹری نے اُس کی منظوری دے دی اور بس۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ضابطے میں اطلاع نہ آجائے اس خبر کو راز میں رکھنا"

میں نے کہا "یہ مانا۔ مگر بھیّا، یہ جو تم نے چھ مہینے مجھے دق کیا اس کا ہرجہ کون برداشت کرے گا؟ اگر پہلے سے یہ نوٹ لکھ دیا ہوتا تو معاملہ اتنا طول کیوں کھینچتا"

یہ خیال کر کے کہ باقاعدہ منظوری آنے پر مجھے پچاس روپے ماہوار کے حساب سے چودہ مہینے کے اکٹھے سات سو روپے یک مشت ملیں گے، میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ جی چاہا سعید کو پیٹ بھر کے مٹھائی کھلا دوں، مگر گاڑی چھوٹ رہی تھی اس لئے میں نے تجویز پیش کی۔

"اس عجلت میں بھلا کیا مٹھائی کھلائی جائے۔ چلو میرے ساتھ گھر، صبح ہی لوٹ آنا۔"

"میری گاڑی پانچ بجپن پر چھوٹتی ہے اور مجھے اپنی بہن کو دیکھنے جانا ہے جو سخت بیمار ہے۔" اس نے سگرٹ کے چھلے بناتے ہوئے کہا۔

"تمھیں کہاں جانا ہے؟" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا، کیونکہ آج تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔

"نگینہ" اُس نے سگرٹ پھینک کر کہا۔

"اور تمہاری بہن کیا بیمار ہیں؟" میں نے یوں ہی اظہارِ ہمدردی کرنے کے لئے کہا۔

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔" جس سے میں سمجھا ضرور مریضِ عشق ہوں گی، اور میں نے اس کی بہن کی بیماری، اس کی لکھنؤ سے آمد کے اسباب اور اس کی خانگی اُلجھنوں کو اس طرح سننا شروع کیا، جیسے میں واقعی اس کی داستانِ غم سے دلچسپی لے رہا تھا۔ میں کبھی تعجب سے آنکھیں پھاڑتا، کبھی منہ بناتا، جیسے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر

میں دراصل بہت رنجیدہ اور فکرمند ہو رہا ہوں، میرا دل درحقیقت ریل میں اور کان سعید کی باتوں پر لگے ہوئے تھے، مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ صرف گارڈ صاحب ہی اب تک سیٹیاں بجا بجا کر اپنے منہ میاں مٹھو بن رہے تھے، اور خود انجن نے کوئی صدائے لبیک بلند نہ کی تھی، میرا ساتھی اب تک پھلوں میں مصروف تھا، اس کا پیٹ اب یقیناً بھر چکا ہوگا، میں نے سوچا، اور اُسے رات کو کھانے پینے کی ضرورت پیش نہ آئیگی" باتیں بھی سب ختم ہو چکی تھیں، اور اب سعید سے کسی نئے موضوع کو چھیڑنے کی نہ فرصت ہی تھی، اور نہ ضرورت، کہ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دے دی، اور میں نے خدا حافظ کہہ کر بھاگتے میں اس سے ہاتھ ملایا اور ڈبے پر چڑھ گیا۔

چھک چھک !! گاڑی چل دی۔

"پچ پچ ہلا ہلا !!

میں نے اپنے ڈبہ میں کوئی جنبش نہ پا کر مایوسی کے ساتھ طنز کیا۔

نیچے اُترا تو ڈبے کے اوپر لگی ہوئی تختی پر نگاہ جا پڑی جس پر لکھا تھا——

"سہارن پور" ——————

مہربانی کر کے ـــــــ!

بلا شبہ وہ نوجوان لفٹ والا ہی غلطی پر تھا جس نے ایک مسافر کو اپنی لفٹ سے دھکیل دیا اور اس جرم کی پاداش میں اُسے جرمانے کی سزا بھگتنی پڑی۔

سوال "مہربانی کر کے" نہ کہنے کا تھا، مدعی نے لفٹ پر سوار ہو کر کہا، "اوپر پہنچا دو"۔ لفٹ والا چاہتا تھا، "مہربانی کر کے اوپر پہنچا دو"۔ مدعی نے جب یہ رسمی الفاظ ادا نہ کئے تو لفٹ والے نے نہ صرف اُس کی خواہش پوری کرنے سے گریز کیا بلکہ مسافر غریب کو اپنی لفٹ سے دھکیل کر دم لیا۔ اخلاق و آداب پر اتنی کڑی تنقید دراصل بہت زیادہ تھی۔ کج اخلاقی کوئی قانونی جرم نہیں، اور نہ قانون کے نزدیک جبر و تشدد کا استعمال ہی جائز ہے۔ اگر کوئی چور میرے گھر میں گھس آئے اور میں اسے زدوکوب کروں تو قانون مجھے معاف کر دے گا۔ یا اگر کوئی میرے اوپر چڑھ آئے تو قانون مجھے مناسب تشدد کے ساتھ اپنی حفاظت کی اجازت بھی دے گا۔ قانون کا یہ فیصلہ دراصل اس لئے ہے کہ چور اور میرا حریف دونوں قانون کے صریحی احکام کی خلاف ورزی کر رہے

ہیں۔ لیکن کوئی قانونی نظام کج اخلاقی کے انسداد کے لئے کوئی کارروائی نہیں کر سکتا اور جس چیز کو وہ خود سزا کے قابل نہیں سمجھتا، اس کے ساتھ تشدد کے استعمال کو کس طرح روا رکھ سکتا ہے۔ لفٹ والے سے ہمیں کتنی ہی ہمدردی ہو ہمیں ماننا پڑے گا کہ قانون اس معاملہ میں حق بجانب ہے۔ اگر ہم اس حد تک آزاد ہوتے کہ جسے چاہیں دے ماریں محض اس خطا پر کہ ہمیں اس کا طرز عمل پسند نہیں، یا لب و لہجہ نہیں بھاتا، یا پیشانی کی شکنوں سے نفرت ہے، تو ہمارے ہاتھ کبھی خالی نہ رہتے اور شہر کی نالیاں ہمیشہ خون سے رنگین رہا کرتیں۔

میں جتنا چاہوں کج اخلاق بن جاؤں۔ لیکن یہ کہ میری کج اخلاقی کا جواب کوئی تشدد سے دے، تو اس سے قانون مجھے ہمیشہ محفوظ رکھے گا۔ میں کتنا ہی سخت کلام اور ترش رُو ہو جاؤں کسی کی مجال نہیں کہ مجھ پر جرمانہ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ لوگ مجھے "بداخلاق" کا خطاب دے دیں گے، اس کے سوا کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ قانون مجھے کسی کا شکریہ ادا کرنے پر یا دوسروں کے جذبات کا لحاظ کرنے پر اس سے زیادہ مجبور نہیں کر سکتا جتنا اس معاملہ میں کہ میں مونچھوں کو تاؤ نہ دوں، یا خضاب نہ لگاؤں، یا چوڑیاں نہ پہنوں۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس لگ جائے تو قانون اس کا کوئی معاوضہ نہیں دلوا سکتا۔ اخلاقی اور ذہنی نقصانات کی تلافی کے لئے قانون کے پاس کوئی علاج نہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ نقصانات نظر انداز کئے جانے کے قابل ہیں۔ ہو سکتا ہے

کہ لفٹ والے نے اس صدمے کو جو اس کی خودداری کو پہنچا اُس ذلت سے زیادہ محسوس کیا جو اُسے ٹھوکر یا گھونسا کھا کر ہوتی، اور جس کے لئے وہ قانونی چارہ جوئی کا بھی مجاز تھا، گھونسے اور ٹھوکر کی تکلیف تھوڑی دیر میں زائل ہو جاتی ہے، لیکن خودداری پر جو زخم لگتا ہے وہ اتنا کاری ہوتا ہے کہ اس کا بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اس لفٹ والے کے نفسیات کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں۔ اگر اُسے مسافر کو دھکیلنے سے روک دیا جاتا تو وہ اس غصے اور ذلت کو یقیناً گھر پہنچ کر اپنی بیوی پر اُتار دیتا۔ بہت کم چیزیں اتنی متعدی ہوتی ہیں جتنی بدمزاجی۔ جب سر انیتھونی ایبولیوٹ نے کپتان ایبولیوٹ کو ڈانٹا، تو کپتان گھٹ کر باہر چلے گئے، اور اپنے ماتحت کو سخت سست کہہ ڈالا۔ ماتحت نیچے اُترا اور چپراسی کو پیٹ دیا۔ شاید وہ شخص جس نے لفٹ والے سے "اوپر پہنچا دو" کہا، اپنے افسر سے جلا ہوا چلا آ رہا تھا، اس بات پر کہ افسر نے اس کی مزاج پُرسی نہ کی تھی، افسر خود بیوی سے ناشتہ پر ڈانٹ کھا چکا تھا، اور بیوی بیچاری کے ساتھ باورچی بدتمیزی کر چکا تھا، اور باورچی غریب سے باورچن کچھ اسی طرح پیش آ چکی تھی۔ ہم بُرے اخلاق سے ساری دُنیا کو گندہ کر سکتے ہیں، زندگی کے دھارے کو جتنا زہریلا بُرے اخلاق و آداب بناتے ہیں اتنا دُنیا کا کوئی جُرم نہیں بنا سکتا۔ ایسی بیوی ایک آدھ ہی نکلے گی جس کے شوہر نے اس پر ٹیڑھی نظر کبھی ڈالی ہی نہ ہو۔ لیکن ایسی بے شمار ہوں گی جو بیچاریاں بدمزاجی کے ماحول میں رہ کر ہمیشہ ایثار و قربانی کی زندگی گذارتی ہیں

اور سدا حسرت و یاس سے ہم کنار رہتی ہیں۔ کچھ بھی ہو قانون ہمارے بجی اطوار و آداب پر پہرا نہیں بٹھا سکتا۔ دُنیا کا کوئی قانون کتنا ہی جامع کیوں نہ ہو جرائم کی طویل فرد اپنے اندر سمو نہیں سکتا، اور دُنیا کی کوئی عدالت کسی ایسے قانون کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی جو ہماری سماجی زندگی، لب و لہجے، حرکات و سکنات اور عادات و اطوار کی اصلاح کے لئے نافذ کیا جائے۔

اگرچہ ہم بیچارے لفٹ والے کے خلاف رائے دینے پر مجبور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے بھی ضرور نکل آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ تعزیرات میں کوئی دفعہ ایسی نہیں جس کے ماتحت آپ "برائے مہربانی" یا اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوں، لیکن خود ہمارے آداب و رسوم جو دُنیا کے ہر قانون سے زیادہ پُرانے اور مقدس ہیں ہدایت کرتے ہیں کہ ہمیں آپس میں شائستگی سے پیش آنا چاہئے۔ شائستگی کے لئے سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ ہم ہر چھوٹی سے چھوٹی خدمت کو سراہیں۔ "برائے مہربانی" یا "شکریہ" آپس میں لین دین کے وہ معمولی کلمات ہیں جو ہم بحیثیت انسان اپنے روز مرّہ میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ معمولی آداب ہیں جن سے زندگی کی مشین کو تیل پہنچتا رہتا ہے اور جن کی مدد سے وہ آسانی سے چلتی رہتی ہے۔ یہ ہمارے تعلقات کو دوستانہ تعاون کی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیتے ہیں جن سے لین دین میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کیا بات ہوئی کہ بڑے چھوٹوں کو حکم دے کر زبردستی ہی کام نکالیں۔

بات تو عجب ہے کہ برابری اور بھائی چارے کا ماحول پیدا ہو جائے۔ بہت ہی کمینہ ہوگا وہ شخص جو ایسے موقعوں پر بھی حکم چلائے جہاں نرمی اور عاجزی سے کام نکالا جا سکتا ہے، اور خوشی خوشی کام نکالنے کی بجائے غصے اور گھٹن کو دخل اندازی کا موقع دے۔

اس سلسلہ میں میں چاہتا ہوں کہ اپنے دوست شریف بس والے کا تذکرہ کروں۔ اس امتیازی خطاب سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں دوسرے بس والوں کی بُرائی پر اُترا ہُوا ہوں۔ اس کے برخلاف میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بہت کم پیشہ ور ایسے ہوں گے جنھیں اپنے کام میں اتنے دشوار گذار امتحانوں سے گذرنا پڑتا ہو جتنا ہمارے ان بس والوں کو۔ اِدھر اُدھر آپ کو ضرور کوئی ایسا بس والا ضرور مل جائے گا جس نے اپنے نزدیک مسافروں کو اپنا پیدائشی دشمن تصور کر رکھا ہو، یا اُن لوگوں میں شمار کر رکھا ہو جن کا خاص پیشہ اُس کو دھوکا دینا ہے، اور جنھیں سختی اور ترشی کے سوا کسی اور چیز سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس زمانے میں اس قسم کے بس والے ذرا کم یاب ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پبلک کو اس معاملہ میں زمین دوز ریلوے کمپنی کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے جو بسیں بھی چلاتی ہے اور اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ اس کے ملازمین اخلاق کے مقررہ معیار سے گرنے نہ پائیں۔ ایسا کرنے میں وہ مسافروں کے لئے ہی دل چسپی اور دل کشی پیدا نہیں کرتی بلکہ ایک اہم سماجی خدمت بھی انجام دیتی ہے۔

اس لئے میں جو اس طبقے کے ایک خاص آدمی کی تعریف کر رہا ہوں

اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں من حیث الجماعت بس والوں سے خدانخواستہ کوئی بیر رکھتا ہوں۔ اس بس والے سے میری ملاقات عجیب حالات میں ہوئی بس میں سوار ہونے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ جیبیں خالی ہیں اور کرایہ ادا نہ ہو سکے گا تو میں بہت گھبرایا۔ میرے اس وقت کے نفسیات کا اندازہ ہر شخص بہ آسانی کر سکتا ہے۔ اس کشمکش کے عالم میں انسان دو ملی جلی کیفیتوں کا مجموعہ بن جاتا ہے، اگر اس کے متعلق کوئی بہتر بن رائے قائم کرے گا تو یہ کہ مکار اور فریبی ہے، اس الجھن کی صورت میں فرض کیجئے بس والا آپ پر کڑی نگاہ ڈالتا اور کہتا، جی ــــ! میں ان پرانی چالاکیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بسم اللہ! باہر تشریف لے جایئے۔ وہ ہے آپ کا راستہ!" تو آپ کا دل کیا کہتا، اور آپ کو کتنا غصہ آتا، اگر بس والا بھلا آدمی ہوتا اور آپ کو بسہولت اُتار دیتا تو آپ بخیریت تمام گھر واپس آجاتے لیکن آپ کی گاڑی چھوٹ جاتی، اور کام کا خواہ مخواہ ہرج ہوتا۔

اپنی جیبوں کو بھولے بھٹکے پیسوں کی خاطر اچھی طرح تلاش کرنے کے بعد میں فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ میں بالکل ننگا ہوں، اور میں نے بس والے سے صاف صاف ایمانداری کے ساتھ کہہ دیا کہ میں کرایہ نہیں دے سکتا، اور مجھے پیدل گھر لوٹنا پڑے گا۔

"آپ گھر کیوں جائیں؟" اس نے بے تکلفی سے کہا، "کوئی بات نہیں! آپ ذرا نہ گھبرائیں۔"

"لیکن میرے پاس تو پھوٹا دھیلا بھی نہیں۔"

"تو کیا ہوا"! اس نے بے ساختہ جواب دیا، میں تو آپ کو ٹکٹ دیدونگا، آپ کہاں جانا چاہتے ہیں۔"؟

اور اس نے اپنے ٹکٹوں کا بنڈل اس طرح نکال لیا جیسے وہ مجھے بینک سے لے کر ہانگ کانگ تک کہیں کا بھی ٹکٹ دینے والا ہو۔

بالآخر میں نے اس سے کہا۔ "تم بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو" میں نے اسے اپنی منزل بتائی اور جب وہ مجھے ٹکٹ دینے لگا تو میں نے کہا:

"اور اس کا کرایہ کہاں بھیجا جائے"؟

"اوہ! پھر کسی دن مل جائیے! اور کیا!! اس نے مسکراتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

خوش قسمتی سے میری انگلیاں جواب تک جیبوں کی گہرائیوں میں غوطہ لگا رہی تھیں، یک لخت ایک شلنگ سے ٹکرا گئیں، اور میں نے فوراً بس والے کا قرضہ چکا دیا۔ مگر اس بات سے اس تفریح میں جو بس والے کے طرزِ عمل سے ہوئی تھی ذرا کمی نہ آئی۔

ایک دن بس میں بیٹھا ہوا میں کچھ پڑھ رہا تھا کہ کسی نے اس زور سے میرا پاؤں کچلا کہ میں تکلیف سے چیخ اٹھا۔ پیر درد کرنے لگا، اور میں غصے سے سرخ ہو گیا۔ مگر اوپر جو نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی پرانا اور مہربان دوست

سامنے موجود ہے۔

"معاف کیجئے سرکار"۔ وہ کہنے لگا، "میں جانتا ہوں میرے جوتے بھاری ہیں اور میں نے انھیں اسی لئے خریدا کہ خود میرے پیر روز کچلتے تھے، لیکن آج میں خود دوسروں کے پیر کچل رہا ہوں، آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟ سرکار معاف کردیں!"

چوٹ میرے بے شک آئی تھی، مگر اس نے اتنے پیار سے انداز میں یہ بات ادا کی کہ دل میں اترتی چلی گئی، اور یہی کہتے بن پڑا کہ "نہیں۔ بالکل نہیں!" اس کے بعد جب کبھی میں اس کی بس پر سوار ہوتا تو وہ ضرور مل جاتا اور اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح بات کرتا کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔

اس میں دو صفتیں خاص طور پر پائی جاتی تھیں، ایک صبر و سکون، دوسرے مسافروں کو آرام و آسائش پہنچانے کا جذبہ۔ میں اکثر دیکھا کرتا کہ جب بارش ہوتی تو وہ دوڑ کر بس کی بالائی منزل پر جا پہنچتا اور ایک ایک مسافر کو بتا دیتا کہ "نیچے آجایئے اندر جگہ موجود ہے"۔ بوڑھوں کے ساتھ وہ اولاد کی طرح پیش آتا، اور بچوں کے ساتھ ماں باپ کی طرح، بچوں کے لئے تو خاص طور پر اس کے دل میں بڑی گنجائش تھی اور وہ اُن سے ہمیشہ ہنسی مذاق میں مصروف رہا کرتا۔ اگر کوئی نابینا بس پر ہوتا تو وہ صرف اس کو جگہ دینے پر ہی اکتفا نہ کرتا، بلکہ جب بس ٹھہرتی تو وہ اپنے ماتحت کو بلا کر حکم دیتا "تم یہاں ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں"! اور خود بوڑھے نابینا کو سڑک پار کرانے یا راستے پر لگانے جاتا۔ المختصر جب تک میں وہاں رہتا یہی دیکھتا کہ فضا

میں مہربانیوں اور مسرتوں کی بارش ہو رہی ہے، اور سفر گویا اخلاق و عادات پر ایک مکمل سبق کی حیثیت اختیار کر لیتا۔

جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ بس والا اپنا کام بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ اگر برے عادات متعدی ہیں تو اچھی خصلتیں بھی اپنے عمدہ اثرات سے ماحول کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر لوگ بے ادبی کا جواب بے ادبی سے دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی کے مقابلہ میں چڑچڑا پن دکھانا کمینہ پن کی انتہا ہے۔ اس معاملے میں جو حال موسم کا ہے وہی آداب کا ہے۔ خوشگوار دن کا کیا کہنا! کیٹس نے کیا خوب کہا ہے، "جب موسم خوشگوار ہوتا ہے تو میں مستانہ وار جھومنے لگتا ہوں" اور جس طرح اچھا موسم بدمزاج آدمی میں جان ڈال دیتا ہے، اسی طرح ہنس مکھ آدمی بڑے سے بڑے افسردہ دل میں گدگدی پیدا کر دیتا ہے۔ اس جہت سے شریف بس والے کی گاڑی میں موسم ہمیشہ پُر بہار رہتا تھا۔ اس کا ذاتی اخلاق، انداز تکلم، اور چال ڈھال، مسافر کا دل موہ لینے کے لئے کافی ہوتے تھے۔ ان کی کلفتوں کو دور کر کے وہ خود اپنے کام کو ہلکا کیا کرتا تھا، اس کی خوش مزاجی ایک ایسا سرمایہ تھی جس میں خسارے کا امکان ہی نہیں۔

عرصہ ہو گیا کہ بس والا مجھے نہیں ملا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ یہ رونق اپنے ساتھ کہیں اور لے گیا، لیکن ہماری اس بے رونق محفل میں اتنی اخلاقی وسعت

کی بھلا کہاں گنجائش : میں اپنے اس فعل پر کہ میں نے ایک غیر معروف لبس والے کی شان میں قصیدہ لکھ دیا ذرا بھی نادم نہیں ہوں۔ اگر ورڈسؔ ورتھ "جونکیں جمع کرنے والے" سے "دلدل کی تنہائیوں" میں سبق حاصل کر سکتا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ چھوٹے آدمی اُن لوگوں سے آداب نہ سیکھیں جنہوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ معمولی پیشہ بھی بلند و بالا درجہ حاصل کر لیتا ہے بشرطیکہ اُسے ہنسی خوشی انجام دیا جائے۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ جنگ نے ہمارے روزمرہ اخلاق پر جس سے کبھی پہلے فضا میں ہر وقت رس گھلا رہتا تھا، بہت برا اثر ڈالا ہے۔ اگر ہم وقتی زندگی کو ایک دوسرے کے لئے خوشگوار بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اخلاقی روایات کو از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن ہم چاہیں کہ قانون کے شکنجے میں کس کر ایسا کریں تو یہ ممکن نہیں۔ پولیس اور قانون دو ایسے ادارے ہیں جو ہماری سوسائٹی کے لئے از بس ضروری ہیں۔ خاص کر اس سوسائٹی کے لئے جو فرشتوں سے کچھ ہی کم درجہ رکھتی ہے۔ قانون ہمیں جسمانی حملوں سے بچا سکتا ہے، مگر اخلاقی وار سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اور نہ ہمیں لفٹ والے کا یہ رویّہ کہ اس نے اخلاقی حملے کا جواب تشدد سے دیا! پرانے اخلاق و آداب کو جگانے میں مدد دے سکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر لفٹ والے کو بدلہ ہی لینا تھا تو اُس کا بہتر طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اُس شخص سے جس نے "مہربانی کر کے" نہ کہا تھا انتہائی شرافت سے پیش آتا۔ اس طریقہ سے وہ اپنے اوپر بھی کامیابی حاصل کرتا، اور اس نامعقول

پر بھی - اور یہی وہ اصلی کامیابی ہوتی جو وقعت رکھتی ہے - ہو سکتا ہے کہ شریف انسان وقتی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے، لیکن روحانی فتح کا سہرا ہمیشہ اُسی کے سر رہتا ہے - لفٹ والے کے لئے لارڈ چیسٹر فیلڈ کا یہ مختصر سا واقعہ بہت مفید ثابت ہوگا - اس زمانہ میں لندن کی سڑکیں پکی نہ تھیں، اس لئے بارش میں جو لوگ دیوار سے ملے ملے چلتے تھے وہ کیچڑ سے محفوظ رہتے تھے، ایک دن ایک شخص راستے میں چیسٹر فیلڈ سے ملا اور کہنے لگا:

"میں کبھی کسی بدمعاش کو دیوار کے نزدیک نہیں چلنے دیتا اور ہمیشہ خود چلتا ہوں"

چیسٹر فیلڈ نے سڑک کے بیچوں بیچ جاتے ہوئے سادگی کے ساتھ جھک کر کہا:

"اور میں ہمیشہ چلنے دیتا ہوں اور خود کبھی نہیں چلتا"

مجھے اُمید ہے کہ لفٹ والا اب مجھ سے متفق ہوگا کہ اگر اس نے اس شخص کو کیچڑ میں نہ دھکیلا ہوتا تو اس کا انتقام اس سے کہیں زیادہ حسین و دل کش ہو گیا ہوتا۔

کھاج

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا لیکن رات کے بارہ بجے غلامی کی منحوس زنجیریں توڑ دی گئیں، اور ٹھیک بارہ بج کر ایک سکنڈ پر ہندوستانیوں نے آزادی کا پہلا سانس لیا، ہندوستان کی فضا میں آزاد ہوا کا پہلا جھونکا چلا۔ انسانوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل مسرت کا جشن منایا، خوشی کے نقارے بجے، شاندار جلوس نکالے گئے۔ اسکول کے ماسٹروں، اور دفتر کے کلرکوں نے خوب چھٹیاں ماریں، بچوں نے مٹھائیاں اور بڑوں نے دعوتیں اڑائیں، بے شک دیش آزاد ہو گیا، لیکن ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا، بلکہ تعمیری کام کا دور تو گویا اب شروع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ کر لیا، کچھ ہو رہا ہے، اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جو کرنا باقی ہے اس میں اہم ترین کام جس کی طرف ہمارے ارباب حل و عقد کے ذہن منتقل ہی نہیں ہوئے انگریزی سامراج کی

چھوڑی ہوئی لعنتوں کو دور کرنا ہے۔ ان لعنتوں میں ایک "دوسری جنگِ عظیم" کا اثر بعد ہے جس کی بدترین لعنت کھاج ہے جس کا آج سارے ملک میں راج ہے افسوس ہے دُنیا کے بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں نے لاکھوں دوائیں ایجاد کیں لیکن کھاج کا ایسا تیر بہدف علاج ایجاد کرنے سے قاصر رہے جو ہمیں کھاج کے سامراج سے خلاصی دے سکے۔

جس طرح سیاسیات میں اس مسئلہ پر کہ ریاست کا آغاز کیسے ہُوا سیاسی مفکرین نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ روسو "معاہدۂ عمرانی" کا قائل ہے اور سر ہنری مین نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں "میراثِ مادری" پر زور دیا ہے۔ اسی طرح علمِ خارش کے طالب علموں نے کھاج کے بارے میں اپنے تجربات کی بناء پر جداگانہ نظریات پیش کئے ہیں۔ بعض توہم پرست مریضوں کی رائے ہے کہ کھاج چونکہ مرض نہیں بلا ہے اس لئے پچھلے جنم میں اس کا چال چلن ضرور خراب رہا ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ کھاج انسان کے تمام جسم کو گھیر لیتی ہے، سب سے زیادہ اُسے وہ مقامات پسند ہیں جو جسم انسانی میں سب سے زیادہ گندے ہیں اور جنھیں وہ پوشیدہ ہی رکھنا پسند کرتا ہے۔ اسی نظریئے کے ماتحت وہ جادو اور ٹونے کے ذریعے سے کھاج کے علاج کے قائل ہیں۔ نمک فروش پنساریوں کا خیال ہے کہ کھاج کا واحد سبب موجودہ زمانے کی شکر ہے جس میں خارش کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف شکر ملوں کے مالکوں کے نزدیک یہ آج کل کے نمک کی تاثیر ہے جو جسم میں خشکی

پیدا کر کے کھاج میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سیاسی سائنس دانوں کی رائے ہیں یہ سب نظریات غلط ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کھاج پھیلنے کا صرف ایک سبب ہے یعنی "ایٹم"۔ اسی لئے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کھاج مشرق میں جاپان اور اس کے قرب و جوار میں پھیل رہی ہے، اور چونکہ مادرِ وطن اس علاقہ کے قریب ہے اس لئے وہ بھی کھاج میں مبتلا ہے۔ اسی لئے انھوں نے کھاج کے مرہم کا نام "ایٹم بم مرہم" رکھا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ جس طرح ایٹم بم چشم زدن میں لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر دیتا ہے، اسی طرح یہ مرہم کھاج کے جراثیم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔

آج کل دنیا کا کوئی سیاسی لیڈر اتنا مقبولِ خاص و عام نہیں جتنی کھاج ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں جس نے کھاج کو مہمان نہ رکھا ہو، اور گھر کی کوئی فرد ایسی نہیں جس نے دل کھول کر اس کی مہمان نوازی نہ کی ہو۔ جنہوں نے کھاج کی تاریخ اور سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پرانے اور اس زمانے کی کھاج میں بڑا فرق ہے۔ پرانے زمانے کی کھاج کو اس کا بڑا خیال تھا کہ روز روز کے آنے جانے اور آئے دن کی مہمان نوازی سے لوگ اکتا جاتے ہیں اور انسان ہمنشینوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت جب وہ رخصت ہوتی تو جسم کو کندن بنا کر چھوڑتی۔ مگر عصرِ حاضر کی کھاج جدت پسند ہونے کے علاوہ نہایت بے تکلف واقع ہوئی ہے۔ موجودہ زمانے کی کھاج نے اپنی روائتی ریت رسم سب بدل ڈالی ہے۔ اب صرف ایک پھیرا لگا کر اس کی تسکین نہیں ہوتی، اور جب ایک بار

نازل ہو جاتی ہے تو اوّل تو جانے کا نام نہیں لیتی اور جب چلی جاتی ہے تو کئی کئی بار پھیرا لگاتی ہے۔ جسم کو کندن اور نروگی بنانے کی بجائے، مستقل طور پر روگی بنا دیتی ہے، اور بعض کو مجسّم کھاج۔

اگر کوئی پوچھے کہ آسمان میں کتنے تارے ہیں یا ہمارے سر میں کتنے بال ہیں تو جواب دینا اتنا دشوار نہیں جتنا یہ بتانا کہ کھاج کی کتنی دوائیں ہیں اگر ہر مریض کو صرف ایک دوا کے حساب سے بھی یاد ہوتی تو سوال زیادہ بے ڈھب نہ ہوتا کیونکہ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے آدمی اتنی دوائیں، ہوا لا مضمون ہو جاتا اور معاملہ صاف ہو جاتا، لیکن یہاں تو یہ مصیبت ہے کہ ان دواؤں کی تعداد بتانا بھی مشکل ہے جو اکیلے ایک مریض کو یاد ہوتی ہیں، کہیں بھولے سے تذکرہ کر بیٹھئے کہ آپ کھاج میں مبتلا ہیں، لیجئے دواؤں کا وہ تانتا بندھے گا کہ توڑا نہ ٹوٹے گا۔ ہر مریض اپنے تجربات بغیر پوچھے بیان کرنا شروع کر دے گا اور ان تجربات اور تحقیقات کو اس قدر زور دے کر اور جوش و خروش کے ساتھ پیش کرے گا کہ جان چھڑانی دوبھر ہو جائے گی، اور آپ کھاج کی تکلیف بھول کر چیخ اٹھیں گے کاش ہم کھاج میں مبتلا نہ ہوئے ہوتے، یعنی اتنی تکلیف وہ خود کھاج نہ رہے گی جتنی وبالِ جان دواؤں کی تعداد بن جائے گی۔

کھاج کا ہر مریض علیحدہ دوا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ دو مریض ایک ہی دوا سے صحت یاب ہوئے ہوں۔ کھاج کا مریض جب شفا پاتا ہے

تو وہ کم از کم بیس دوائیں استعمال کر چکا ہوتا ہے تب آخر میں کوئی ایک دوا کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وہ دوا سے اچھا ہوتا ہی نہیں۔ وہ غسل کرنے کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ ایک دن بھول کر غسلِ صحت بھی کر ڈالتا ہے یا دوسرے الفاظ میں کھاج بددل ہو کر خود بخود اس کا پیچھا چھوڑ دیتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے انگریزی سرکار نے ہندوستان کا چھوڑا۔

دنیا میں بے شمار بیماریاں ہیں، ان میں بعض معمولی بیماریاں ہیں۔ بعض مہلک اور پھیلنے والی نزلہ زکام اور کھانسی معمولی بیماریوں کی فہرست میں آتی ہیں۔ ہیضہ، طاعون اور دِق مہلک اور متعدی بیماریاں ہیں، کھاج پھیلنے والی بیماری ہے مہلک نہیں، کھاج کا مریض مرتا نہیں، لیکن بیماری کی حالت میں ادھ مرا ضرور ہو جاتا ہے۔ پرانے زمانے کی کھاج صرف جاڑوں میں ہوا کرتی تھی اور گرمی آتے ہی خود بخود دور ہو جاتی تھی۔ اب ہر موسم میں ہوتی ہے۔ ہیضہ اور طاعون موسمی بیماریاں ہیں، کھاج بارہ ماسی ہے۔

دِق کی طرح کھاج کے بھی تین درجے ہیں، پہلے درجے میں مریض ہاتھوں کی گھائیوں اور دوسرے جوڑوں میں کھجانا شروع کرتا ہے۔ اس منزل میں مریض کے نفسیات یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مرض کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو فی البدیہہ مصرعہ چست کر دے گا "کھاج! مجھ کو! جی نہیں!" اس منزل پر کھجانے میں بہت مزہ آتا ہے۔ جی چاہتا ہے بس کھجائے جائے، اور جب

ہاتھ تھک جائیں تو دوسروں سے کھجو لیئے۔ دوسرے درجے میں متاثرہ مقامات پر ننھے ننھے دانے بننے لگتے ہیں، جن میں پانی پڑ جاتا ہے۔ کھجلی میں بدستور مزہ آتا ہے، بلکہ مزے کے ساتھ کھجلی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کھجانے کے لئے جوتے کا برش قسم کے آلات استعمال کرنا پڑتے ہیں، اور اس کی خاطر انتہائی ضروری کام کو ملتوی کر دینا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ناخنوں کو کھرپا بنائے رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن افسوس ناخن گھستے گھستے آدھے رہ جاتے ہیں، جسم کی کھال چھل جاتی ہے، اور ننھے ننھے دانوں میں پیپ پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ گویا تیسرے درجہ کی ابتدا ہوتی ہے دوسرے درجہ میں بھی مریض اپنا مرض چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتا ہے اور خارش کے دو دوڑوں کو مچھر کا کاٹا بتاتا رہتا ہے، لیکن تیسرے درجہ میں مرض چھپائے نہیں چھپتا، اور بیچارے مریض کو اقبالِ جرم کر کے سر نیچا کرنا پڑتا ہے۔ اس درجہ میں کھجلی اور مزے میں کمی، اور تکلیف میں زیادتی شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی بیٹھنے سے معذور ہو جاتا ہے، کوئی اچھا خاصا ہوتے ہوئے لنگڑانے کی مشق کرنے لگتا ہے۔ کسی کا ہاتھ مکا کا بھٹا بن جاتا ہے۔ پھنسیاں چیچک کی طرح اُبل پڑتی ہیں، اور تمام جسم پھنسیوں سے ڈھک جاتا ہے، راتوں کو نیند اُڑ جاتی ہے، کم و بیش وہی تکلیف سہنی پڑتی ہے جو دق کے مریض کو۔ البتہ یہ اطمینان ضرور رہتا ہے کہ تکلیف سے مر رہے ہیں مگر سچ مچ نہیں۔

طب کے کئی مدرسے ہیں۔ ان میں دو خاص طور پر مشہور ہیں، ایک وہ جو

علاج بالضد کے حامی ہیں اور وہ ایلوپیتھ کہلاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کا جسم سردی سے متاثر ہو گیا ہے تو وہ گرم دوا دیں گے تاکہ سردی کے اثرات دور ہو جائیں۔

دوسرے وہ ہیں جو علاج بالمثل کی سفارش کرتے ہیں اور وہ ہومیوپیتھ کہلاتے ہیں۔ مثلاً جمال گوٹہ دست وقے لاتا ہے تو اگر کسی کو بدہضمی کی شکایت ہو تو وہ جمال گوٹہ خورد بینی مقدار میں جسم کے اندر پہنچا کر آپ کی قوتِ حیات کو بیدار کر دیں گے۔ دیگر امراض کی طرح کھاج کا علاج دونوں مدرسوں کے ماہرین کرتے ہیں۔ اوّل الذکر کھاج کو نفاست پسند اور آخر الذکر غلیظ اور گندہ فرض کر کے ایسی دوائیں تجویز کرتے ہیں جنھیں خوشبو اور صفائی سے پیدائشی بیر ہے۔ علاج بالضد کرنے والے گندک اور علاج بالمثل کرنے والے گائے کا پیشاب، حقّہ کا سڑا ہوا پانی یا گوبر وغیرہ تجویز کرتے ہیں جس کے باعث کھاج کے مریض کے پاس بیٹھنا قوتِ شامہ کو سخت امتحان میں مبتلا کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ کھاج کے مریض کے بستر اور کپڑے ایک عجیب قسم کی بو میں بسے رہتے ہیں۔ کھاج کی دواؤں کی بہترین بو، باس کو خوشبو کا نام کسی عنوان نہیں دیا جا سکتا، اور باوجود کوشش کے بدبو کے خانے میں رکھنا پڑتا ہے۔ مریضِ خارش کا جسم ہمہ وقت روغن و عطر گندھک میں بسا رہتا ہے۔ لہٰذا ہمارا آپ کا اور ہر اس شخص کا جو کھاج میں مبتلا ہو چکا ہے یہ فرض ہے کہ اس گھر یا اس شخص کو جو کھاج میں مبتلا ہو، دور سے سلام کریں۔

بعض مریض جو کھاج کا علاج کرتے کرتے خود نیم حکیم کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں چپہ چپہ کی کیچڑ کو سب سے زیادہ مفید بتاتے ہیں، لیکن واہ رے کھاج کہ اس تمام گندگی

کے باوجود گندہ پیشہ کرنے والوں کے قریب نہیں پھٹکتی۔

کھلج جب حملہ کرتی ہے تو موٹی توند والے ساہوکار پر یا آرام طلب نکمے اور عیش پسند زمیندار پر۔ مزدور سے اسے خاص ہمدردی ہے۔ کاش کہ یہ مایہ پرست دُنیا کھلج ہی سے سبق سیکھ لیتی تو آج نہ جانے کتنی اقتصادی گتھیاں بیٹھے بیٹھے سُلجھ جاتیں اور یہ آئے دن کے سیاسی، مذہبی سماجی اور معاشرتی جھگڑے جن کی بنیاد اقتصادی اونچ نیچ پر قایم ہے۔ بہت جلد ختم ہو جاتے۔

آزادی کے دن —!

ہاتھ جو مارا تو چڑا میری مٹھی میں تھا۔

میں قیدی کو اسی طرح ہاتھ میں لے صحن میں آ گیا۔ بچوں میں شور مچ گیا جیسے امتحان کا نتیجہ آ گیا ہو۔ سارا گھر "ہم لیں" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ملک میں جشنِ آزادی منایا جا رہا تھا۔ گھر میں غلامی پر قہقہے لگنے لگے۔ منّی بولیں "ہم لیں"۔ چُنّی نے کہا "ہمیں دیجئے"۔ منّے جو پربھات پھیری سے ابھی ابھی لوٹ کر آئے تھے، اپنا دعویٰ الگ جتانے لگے۔ بیگم بولیں "اچھا ہوا موئے کا علاج ہی یہ تھا۔" امّاں بھی غریب سے جلی بیٹھی تھیں، کہنے لگیں: "ہرگز نہ چھوڑنا موذی نے ستایا ہی بہت تھا۔" ماما جو بے اولادی تھی۔ ٹانگ اڑانے لگی۔ "اچھے میاں چھوڑنا مت اسے میں پالوں گی۔"

میں بہت دنوں سے چڑے کو سزا دینے کی فکر میں تھا، مگر وہ کسی طرح میرے قابو میں نہ آتا تھا۔ آج اُس نے بغیر کسی دشواری کے اپنے کو میرے حوالے کر دیا۔ آئینے کے سامنے اپنے حریف سے جنگ میں ایسا اُلجھا کہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ بچے شور مچاتے پھر رہے تھے، بیگم بیٹھی چھالیاں کتر رہی تھیں، ماما چولھا جھونک رہی تھی اور چڑا آئینے کے سامنے ایک دوسرے چڑے سے لڑائی میں مصروف تھا۔ معاً مجھے مذاق سوجھا۔ چڑے کو گرفتار کرنے کے لئے نہ میں نے جال بچھائے، نہ کوئی چال چلی۔ میں صرف اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میرا عکس آئینے میں چڑے کو نہ دکھائی دے سکے، اور ہاتھ بڑھا کر چشم زدن میں چڑے کو پکڑ لیا۔ اب پکڑ لیا تو سوال پیدا ہوا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، کیا سزا دی جائے، اور کس طرح دی جائے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور مجھے جانے کی جلدی تھی، برسات کی خوش گوار صبح تھی۔ کئی دن کی مسلسل بارش کے بعد آج پہلی بار آسمان اتنا نکھرا ہوا نظر آ رہا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ دن بھر مطلع صاف رہے گا۔ فضا پر سکون تھی صبح بنارس کا لطف آ رہا تھا۔ ہر طرف رونق تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ شہر میں یوم آزادی منایا جا رہا تھا۔ اسکول کے بچوں کے جتھے "ہندوستان کی جے ہو، مہاتما گاندھی کی جے ہو!" کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے ٹاؤن ہال کے جلسۂ عام میں شرکت کرنے کے

لئے جا رہے تھے۔ جہاں مجھے بھی تقریر کرنی تھی۔

کمزوری اور بے بسی کے عالم میں انسان عدم تشدد کا ہتھیار استعمال کرتا ہے اور ستیہ گرہ کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ وہ ہتھیار اور پالیسی جس کے ذریعہ سے ہندوستان نے آزادی حاصل کی، مگر چڑے نے انسان کی تقلید نہیں کی، اس نے آزاد ہونے کے لئے کئی بار پر پھڑپھڑائے، اپنی ننھی منی چونچ سے میرے ہاتھ کو زخمی کرنے کی کوشش کی، میری ہتھیلی میں پنجے گڑو دیئے اور آزادی کے لئے بہتیری جدوجہد کی مگر ناکام رہا۔ اس کی جدوجہد کا ردِ عمل مجھ پر یہ ہوا کہ میں نے اپنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط کر لیا۔ مایوس ہو کر اس نے مجھے غور سے دیکھا جیسے اپنی شکست کا اعتراف کر رہا ہو۔ میں نے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اسے بتا دیا "پیارے دوست! تم نے میرے ساتھ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے آج میری باری ہے" چڑے کی گذشتہ زندگی، اس کی ناشائستہ حرکات، اور برے طرزِ عمل کا نقشہ فوراً میری آنکھوں میں پھر گیا۔ مجھے ایک ایک کر کے اپنی وہ تمام تکلیفیں یاد آگئیں جو چڑے کے ہاتھوں مجھے پہنچی تھیں۔ ایک تصویر کے بعد دوسری سامنے آنے لگی جیسے خاموش فلم دیکھ رہے ہوں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیکھنا شروع کیا۔ چڑا سنگار میز کے بڑے آئینہ کے سامنے کھڑا ایک دوسرے چڑے کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ دونوں میں ایسی شدید جنگ ہو رہی ہے کہ الاماں والحفیظ! چڑا اپنے حریف پر حملے پر

حملہ بول رہا ہے۔ حریف تڑ کی بتڑ کی جواب دے رہا ہے۔ چڑے نے داؤ کیا حریف نے جھٹ توڑ کر دیا۔ چڑا اُس پر جھپٹا وہ چڑے پر، پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ دم لینے کے لئے علیحدہ ہو گئے۔ لڑتے لڑتے تھک گئے تھے اور محنت کر کے سانس پھُول گیا تھا۔ ایک ہانپا تو دوسرا بھی، چڑے کو اس پر تاؤ آگیا کہ حریف میرا مذاق اُڑاتا ہے۔ جو میں کرتا ہوں اُس کی وہ نقل کرتا ہے، ضرور یہ کوئی بہادر چڑا ہے۔ اس کا پھر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ادھوری لڑائی چھوڑ کر بھاگنا شرمناک ہے اور اصول جنگ کے منافی۔ نعرۂ تکبیر لگا کر ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ اب کے نئے داؤ چلے، اور نئے پینترے استعمال کئے، کبھی پر نوچنے کی کوشش کی، کبھی آنکھ پھوڑنے کی، کبھی سر زخمی کرنے کی، جب کوئی داؤ باقی نہ رہا تو تھک کر بیٹھ رہا۔ حریف نے بھی یہی کیا۔

اس دوران میں چڑیا عرب عورتوں کی طرح برابر کھونٹی پر بیٹھی بڑے جوش کے ساتھ اپنے شوہر کی ہمت بڑھاتی رہتی، بہادری اور جوش پیدا کرنے والے اشعار پڑھتی، اپنی زبان میں شوہر کی جوانمردی اور شمشیر زنی کی تعریف میں خوش الحانی اور ترنم کے ساتھ ایسے ایسے قصیدے پڑھتی کہ جریر اور فرزدق کی رُوح تڑپ اُٹھتی۔ کبھی کبھی جوش میں شوہر کے دوش بدوش لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔ اِدھر سے حریف کی بیوی نکل آتی، اور پھر دونوں میں وہ جوتی چلتی، وہ وہ کوسنے دیئے

جلتے، ایسی ایسی گالیاں ایک دوسرے پر صرف کی جاتیں کہ شوہروں کو شرم آنے لگتی اور مجبوراً اُنھیں کہنا پڑتا۔ "بیوی چلو۔ اب پھر لڑیں گے۔"

مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات میں نے چڑیا چڑے کو سارا سارا دن اسی طرح مصروفِ کارزار دیکھا ہے۔ اکثر میں نے بڑے آئینے کو میدانِ جنگ بننے سے محفوظ رکھنے کی خاطر کوئی کپڑا یا بڑا تولیہ آئینہ پر ڈال دیا، لیکن اس قسم کی تمام تدبیریں ناکام رہتی تھیں۔ کیونکہ کسی کی بے پرواہی سے یا ہوا کے جھونکے سے کپڑے یا تولیہ کا کوئی حصہ بھی ہٹ جاتا اور آئینے کا کوئی گوشہ بھی خالی رہ جاتا تو چڑیا چڑے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھا لیتے۔ اور اپنے حریف سے کشتی شروع کر دیتے۔

جب میں اور بیگم زنانہ مکان کے ایک کمرے میں سوتے تھے تو چڑے نے محض ہمیں چڑانے کی خاطر خاص ہماری چارپائیوں کے اوپر والی کڑی میں گھونسلا بنا رکھا تھا۔ چڑا تنہا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی تھی اور اسی گھونسلے میں اُن کے بچے بھی ہوئے جو وہیں پلے بڑھے۔ مجھے وہ منظر کبھی نہ بھولے گا جب اس کنبے نے ہمارے بستروں کو اپنی بیٹ سے سیاہ و سفید چھینٹ کا گنگا جمنی نمونہ بنا دیا تھا۔ ہم میاں بی بی اور بچے روزانہ اُن کے مہتر کے فرائض انجام دیتے دیتے تھک گئے، لیکن اُن میاں بی بی اور بچوں نے ہم پر ذرا رحم نہ کھایا اور برابر بلا تنخواہ کام لیتے رہے، پھر آج مزدور نے ساہوکار کو دبوچ لیا تو شکوہ کیسا! چڑا کلبلایا اور میں نے قیدی کی گرفت کو

اور مضبوط کر دیا۔

تنگ آ کر ہمیں ایک دوسرے کمرے کو اپنا سونے کا کمرہ بنانا پڑا، لیکن چڑیا چڑے کو ہم سے بہر حال ضد ٹھہری۔ اُنھوں نے بھی ہجرت کر لی، اور مع سامان ہمارے نئے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ چڑے نے فوراً اپنے کو شر نار بھنوں میں رجسٹر کرا لیا تلاش مکان میں اُسے کسٹوڈین کی امداد کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پلنگ کے خاص اُوپر والی کڑی میں اُسے جگہ بھی مل گئی، کون سی ایسی تدبیر تھی جو میں نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے استعمال نہ کی ہو۔ اس کے شہر بدر ہونے کا اعلان کیا، اُس کے داخلہ پر پابندی لگائی، گرفتاری کا وارنٹ جاری کرایا۔ اور ساتھ ہی گرفتار کرنے والے کو انعام دینے کا وعدہ بھی کیا، لیکن اس قسم کی سیاسی پابندیاں اس کی روک تھام کرنے میں ناکام رہیں، بلکہ اس کا اُلٹا اثر یہ ہُوا کہ اس کی جسارت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ دیدہ دلیری سے کمرے میں آتا جاتا اور کھلم کھلا کمرے پر برابری کے قبضہ کا دعویٰ کرتا تھا۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو میں نے چاروں طرف پہرے لگا دیئے، کھڑکیاں بند کرا دیں۔ دروازوں پر "اندر آنا منع ہے" لکھوا دیا اور روشن دان پر "یہ عام راستہ نہیں ہے" کی تختی لگوا دی اور اطمینان سے پڑ کر سو یا، رات کو آنکھ کھلی تو پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ چڑا کمرے میں موجود تھا۔

اگلے دن صبح کو اُٹھ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا۔ کہ اپنے اردلی کو حکم سنا دیا کہ

آج ہی ملکہ ابھی ابھی اس کڑی پر اِدھر سے اُدھر تک کاغذ منڈھوئے تاکہ چڑے کو قیام کی جگہ نہ مِل سکے۔ شاخ ہی نہ ہوگی تو آشیانہ کہاں بنائے گا اردلی بیچارے نے دن بھر بڑی کاوشوں سے کڑیوں پر کاغذ منڈھا۔ میری ہدایت کے مطابق اس کے گھونسلے میں گودڑ ٹھونسا۔ اس رات کو میں نے دیکھا کہ چڑا آرام نہ کر سکا۔ سردی کے موسم میں بیچارہ رات بھر بے چین رہا۔ لیکن اس نے ہمّت نہ ہاری۔ دو چار ہی دن میں اُس نے اور اُس کی بیوی نے مِل جل کر اپنی چونچوں اور پنجوں سے کاغذ پھاڑ ڈالا، گودڑ نکال کر پھینک دیا اور ہمارے بستر ہی پر کوڑے کا ڈھیر لگا کر اپنے گھونسلے پر اس طرح قبضہ کر لیا۔ جیسے شبو اجی نے اپنے گھر پر کیا تھا۔

وہ نقشہ بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا کہ میں نے آئینے کو صاف کیا اور اُدھر چڑیا چڑے نے مِل کر اپنی بیٹ سے اُسے تختۂ گل بنا دیا۔ ہماری سنگار میز اپنے بڑے آئینہ کے ساتھ ہمارے سونے کے کمرے میں رکھی رہتی ہے۔ چڑے کو خود بینی اور چڑیا کو خود آرائی کا بڑا شوق ہے۔ اکثر یہ جوڑا بڑے آئینے کے چوکھٹے پر بیٹھتا ہے اور بیٹ کے ہار گوندھنا شروع کر دیتا ہے۔ آئینے پر بیٹ کے اتنے انبار لگ جاتے ہیں کہ صورت دکھائی دینی بند ہو جاتی ہے، اور اگر روزانہ صاف نہ کرایا جائے تو آئینہ پتھر بن جاتا ہے۔ بیٹ کے کچھ ایسے نقش و نگار بن جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کسی کاریگر نے بڑے اہتمام کے ساتھ آئینے کو رشکِ چمن بنانے کی کوشش کی ہے

ایک آئینہ ہی کیا کوئی تصویر ایسی نہیں جس پر سہرے کی لڑیاں نہ لٹک رہی ہوں۔ ایک دن میرے ایک دوست کی تصویر کا چورا چورا کر دیا۔ دونوں میاں بیویوں نے تصویر کو جھولا سمجھ کر پینگ بڑھانی شروع کر دی اور یک لخت چھوڑ کر چمپت ہو گئے۔ تصویر نیچے آ رہی۔ ایک چینی کی پیالی جو کارنس پر رکھی تھی توڑ ڈالی اور پورا سٹ بیکار کر دیا۔ سوٹ نیا ڈھل کر آیا تھا، پہننے کے لئے ہینگر پر لٹکایا۔ چڑیا چڑے فوراً اپنے تصرف میں لے آئے اور بیٹ کے نقش و نگار سے اُسے چھاپ دیا۔ دفتر کا صندوقچہ بیٹ سے رنگا رہتا ہے۔ بک کے سفید جوتوں پر بیٹ کے نشانات موجود ہیں۔ کتابیں جو میز پر رکھ دی جاتی ہیں۔ فوراً بیٹ کی رنگ برنگی تحریروں سے چھپ جاتی ہیں۔ کمرہ کیا ہے چڑیا چڑے کا بَم پُلِس ہے۔

جوں جوں میں نے سوچا نئی نئی باتیں یاد آتی گئیں، اور غصّہ بڑھتا گیا، اب جوشِ انتقام اپنے پورے عروج پر تھا۔ "شریر چڑے"! میں نے قیدی کو مخاطب کیا، "تم نے پچھلے دنوں میری ایک تصویر کو چورا چورا کیا تھا۔ جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ میرے ایک دوست کی تصویر جو اس دُنیا میں نہ تھا اور جس کی صرف ایک یہی یادگار رہ گئی تھی۔ کیا وجہ ہے کہ آج تمہارا گلا نہ گھونٹ دیا جائے۔ آج تم میرے چنگل میں ہو۔ میں بہت دنوں سے تمہاری تاک میں تھا۔ آج موقعہ ہے کہ تمہاری کارستانیوں کا ایک دفعہ ہی بدلہ لے لوں۔" قیدی نے تکلیف سے اِدھر اُدھر

گردن گھمائی۔ غالباً وہ کہنا چاہتا تھا۔ "بے بس ہوں جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں۔"

عالی ظرفی اور رحم انسان کے دو ممدوحہ صفات ہیں۔ میں اس وقت ان دونوں صفتوں کا مرکز بنا ہُوا تھا، مجھے چڑے پر رحم آنے لگا، میری خودداری نے ایک ننھے، بے بس اور معصوم پرند کی جان لینے سے انکار کر دیا۔ اِدھر جوشِ انتقام نے کروٹ لی۔ اور چڑے کے خلاف کڑی کارروائی کرنے کا تقاضا کیا۔ میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ رحم کہتا چھوڑ دو، اور انتقام کہتا مار دو۔ اگرچہ دماغ کے ایوان میں اس وقت اکثریت انتقام کی جماعت کو حاصل تھی اور استصواب رائے کیا جاتا تو فیصلہ انتقام ہی کے حق میں آتا۔ لیکن میں نے بہرحال اس خاص معاملے میں رائے شماری کو مناسب نہیں سمجھا۔

دوسری طرف میں نے خیال کیا کہ آج دنیا آزادی کا جشن منا رہی ہے، اور میں نے اس کمزور چڑے کو اپنے پنجے میں دبا رکھا ہے۔ مجھے اپنے وطن کی غلامی، بدیشیوں کے مظالم، اور مادرِ وطن کی سپوتوں کی قربانیاں یاد آگئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل معصوم قیدی کی طرف سے نرم ہونے لگا۔ بے شک چڑے نے مجھے اذیتیں پہنچائی تھیں۔ لیکن وہ تو سب وقتی تکلیفیں تھیں اور میں —— میں اس کی جان لینے پر تلا ہُوا تھا۔ جان لینے کے خیال سے مجھے شرم آنے لگی۔ اِدھر بچّوں کی ہٹ، بیگم کی ضد، اور ماما کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میں سمجھا

جیسے قوتِ فیصلہ سلب ہو گئی۔ آخرکار ذہن کی عدالت نے فیصلہ سُنا دیا۔
یہ فیصلہ چڑے کے حق میں تھا، میں نے اپنی گرفت کو ڈھیلا کر دیا۔ چڑا ـــــ
پُھر سے اُڑ گیا اور اپنی چڑیا سے جا ملا جو دیوار پر بیٹھی اپنے پتی کا راستہ
دیکھ رہی تھی۔

بیگم بولیں، "یہ کیا کیا"!

مُنی نے کہا، "چک چک!! ہا ہا!!"

مُنے رونے لگے۔

ماما بولی، "واہ میاں واہ پکڑا کیوں تھا، جو چھوڑ دیا؟"

میں نے کہا، "بڑی بی بی اولاد کا شوق ہے تو بلی پالو۔ چڑا ننھی سی جان
بھلا کیا تمہارے ذوق کی تسکین کرتا۔"

میں جانتا تھا کہ میرے اس عمل سے گھر والے خوش نہ ہونگے، مگر میرا قلب
مطمئن تھا کہ آزادی کے دن میں نے ایک غلام کو آزاد کیا۔

چڑیا چڑا اب بھی میرے کمرے میں رہتے ہیں، لیکن ان کی بُرائیوں میں اب
میں معصومیت کی جھلک پاتا ہوں۔ وہ میرے دوست ہو گئے ہیں اور مجھے اپنا سمجھتے
ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کمرے میں رہے۔ ان کا اس پر حق ہے۔ پھر میں انھیں نکالنے
والا کون؟۔ اور اب تو میں اُن کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ جس دن اُن کی چیں چیں
سُنائی نہیں دیتی تو مجھے کمرہ بے رونق اور اُداس نظر آنے لگتا ہے۔ چڑیا چڑا زندہ باد!

کباڑی

ڈالر کی کمی اور کرنسی کے پھیلاؤ سے ہندوستان اس وقت جس اقتصادی بحران سے گذر رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر علی قدرِ مراتب جنتا کی ہر فرو نے محسوس کیا ہے۔ "بہت سا کاغذ، اور بہت سا افلاس ایک ساتھ پایا جا سکتا ہے۔" یہ الفاظ اُنیسویں صدی میں واشنگٹن اِروِنگ کی زبان سے نکلے تھے، لیکن مادرِ وطن پر من وعن آج بھی صادق آرہے ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں آٹا پیسے کا سوا سیر اور گھی پیسے کا ڈھائی چھٹانک بکا کرتا تھا۔ یہ باتیں ہمارے لئے قصّۂ پارینہ بن گئی ہیں۔ آج کل پورا سوا سیر آٹا آٹھ آنے میں اور ڈھائی چھٹانک گھی روپے میں بھی میسّر نہیں۔ خدا بھلا کرے کنٹرولی گھی اور کنٹرولی آٹے کے موجد کا جس نے موجودہ نسل کی توانائی اور صحت کے لئے یہ نیک کام کیا۔ جنتا فاقے کرتے کرتے تھک جاتی ہے

نگر دماغ اسکیمیں بناتے بناتے نہیں تھکتے۔ سوچتی ہے بھُس کھانا شروع کردے۔ مگر گاؤ کشی کے انسداد سے چارہ بھی مہنگا ہو گیا، اور اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ لوگ گائے کشی کے ساتھ "بچہ کشی" کا انسداد کریں اور "دختر کشی" جیسی دیرینہ اور مقدس رسوم کو پھر سے زندہ کرلیں، اور اس سے بھی کام نہ چلے، تو "خودکشی" پر آمادہ ہو جائیں، بغاوت کریں جیل جائیں۔ یا ان باتوں کے لئے ہمت نہ پڑے تو پھر کباڑی کی دوکان کھول بیٹھیں اور ہو سکے تو کسی بڑے آدمی سے اس کا افتتاح کرالیں۔

کسی چھوٹے آدمی کا کباڑی کی دوکان کھولنا، اور کسی بڑے آدمی کا اس کی رسمِ افتتاح انجام دینا، بشرطیکہ احساسِ کمتری موجود نہ ہو، کوئی ذلت کی بات نہیں ہے۔ اگر سلیقہ کے ساتھ کیا جائے تو ہر کام اعلیٰ درجہ اور ہر پیشہ بلند حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ دُنیا میں کتنے آدمی ہیں جو کباڑی کی دوکان نہ رکھتے ہوئے کباڑیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کباڑیت کا عنصر تھوڑا بہت ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ریل میں، تھانہ تحصیل میں، سرکاری دفتروں میں، عالی شان کوٹھیوں میں، فینسی دوکانوں میں، ڈالمیا اور برلا کے کارخانوں میں زندگی کے ہر شعبہ میں، دنیا کے ہر گوشہ میں، حتیٰ کہ شاعر کے کلام میں، اخبار کے لیڈر میں، لیڈر کی تقریر میں۔۔۔ کس جگہ کباڑ نہیں ملتا۔

پانچوں اُنگلیوں کی طرح، غزل کے سب شعر یکساں طور پر اچھے نہیں

ہوتے۔ دس پانچ واقعی عمدہ تو دو چار کباڑ خانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں اور مشاعروں میں خاصی داد حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جن لیڈروں کو تقریر کا دورہ پڑتا ہے۔ کبھی کبھی جذبات سے متاثر ہو کر ایسی کچی باتیں کہہ ڈالتے ہیں جو کباڑی بازار میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں اور پارلیمنٹ میں جوتیوں میں دال بٹوا دیتی ہیں۔

بعض لوگ پیدائشی شاعر ہوتے ہیں یا پیدائشی لیڈر یا پیدائشی جنرل لیکن کوئی کباڑی کبھی پیدائشی کباڑی نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں پیشے نسلاً بعد نسلٍ چلتے ہیں اور جس کا باپ بڑھئی ہے وہ بڑھئی، اور جس کا لوہار ہے وہ لوہار بن جاتا ہے۔ یا کم از کم ڈاکٹر کا بیٹا حکیم، وکیل کا بیٹا مختار، اور ماسٹر کا بیٹا منشی ضرور بن جاتا ہے لیکن کباڑی اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ کباڑی کا نہ باپ کباڑی ہوتا ہے نہ بیٹا۔ کسی کباڑی کو آج تک یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس نے بحیثیت کباڑی کے اپنی تجارت کی ابتدا کی ہو، کباڑی تلنگے اور ٹھیلے والوں کی طرح، دوسری منازل ہیں طے کر کے مختلف کاروبار میں اچھی طرح قسمت آزمائی کرنے کے بعد، ساری دنیا کا چکر کاٹ کر "زمین گول ہے" کا عملی ثبوت دیتا ہوا کباڑی کی منزل پر آ کر ٹکتا ہے، اور کباڑی ہوتے ہوئے بھی کئی کئی دھندے چلاتا رہتا ہے۔

ہر کباڑی بیک وقت کباڑی ہو سکتا ہے اور حجام بھی، یا کباڑی بھی اور لوہار بھی۔ اگر آپ کو کسی ایسے حجام سے بال بنوانے کا اتفاق ہو جو

بدقسمتی سے کباڑی بھی ہے تو یقین کیجئے، آپ کی خوب خوب "حجامت" بن جائیگی کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ حجام کباڑی جن کا اصلی پیشہ "حجامت" اور ثانوی "کباڑیت" ہوتا ہے، وہ عام طور پر کباڑ کے گاہک کو حجامت کے گاہک پر ترجیح دیتے ہیں، کتنے سر ادھورے، کتنی ڈاڑھیاں بے منڈی، اور کتنے بال بے بنے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ گاہک بے چارہ اپنی نصف ڈاڑھی منڈوائے بیٹھا ہے اور کباڑی صاحب ٹھاٹ سے کباڑ خانے میں گاہک سے قیمت چکا رہے ہیں۔

اگر بزاز، بنئے، یا بساطی دوکانداری کے اوقات میں اپنی دوکان سے غائب ہوجائیں تو اُن کی تجارت ٹھپ ہوجائے اور وہ تباہ ہوجائیں۔ بخلاف اس کے کباڑی اگر غائب رہے تو کچھ نقصان نہیں۔ کیونکہ جب وہ نئے خزانوں کی تلاش میں، نئے شکار پھانسنے کی جستجو میں، یا کوڑیوں کے مول چیزیں خریدنے کی فکر میں سرگرداں پھرتا ہے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اس کی دوکان بڑے اطمینان سے خالی پڑی رہتی ہے اور کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اس پر ٹیڑھی نگاہ ڈال سکے۔

چرب زبانی کباڑی کے کردار کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر کامیاب کباڑی بننا ناممکن ہے، چالاک کباڑی کی زبان ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہے۔ چیزوں کی تعریف پر آئے گا تو زبان اُس سے دو ہاتھ آگے چلے گی۔ تعریفوں کا طوفان میں ایسا چھوٹے گا کہ جملوں کے ہونٹوں میں اور لفظوں کے ڈاڑھی میں

پھنسنے سے کہیں دم لے تو خیر، ورنہ منزلِ مقصود پر جا کر ہی تھمے گا۔ اگرچہ بال کی تعریف میں وہ کنجڑی سے کم نہیں ہے لیکن گاہک پر بال خریدنے کے لئے کبھی زور نہیں دیتا، جیسے اُسے کچھ پروا نہیں، چاہے خریدو چاہے مت خریدو اُس کی بلا سے!

فن کار کباڑی فیشنی دوکانداروں کی طرح اپنی چیزوں پر قیمت کی چٹیں، لگائے رکھتے ہیں۔ اس میں کئی فائدے ہیں، اوّلاً یہ کہ گاہک پر خواہ مخواہ رعب پڑتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ آرام رہتا ہے کہ بار بار گاہک کو قیمت بتانے سے نجات مل جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چالاک کباڑی اس ترکیب سے بڑے انوکھے انداز میں فائدہ اُٹھاتا ہے۔ وہ ضعفِ بصر یا چشمہ موجود نہ ہونے کا بہانہ کر کے گاہک کو خود قیمت پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور جب گاہک پڑھتا ہے "آٹھ آنے" ! تو کباڑی یک لخت فن کارانہ انداز میں چونک پڑتا ہے: "ارے! اتنی کم قیمت! یقیناً قیمت لکھنے میں میرے لڑکے نے غلطی کی ہے۔ اے صاحب کیا بتاؤں یہ سب میری آنکھوں کی بدولت ہے۔ آنکھیں ہوتیں تو یہ غلطی کیوں ہوتی۔ لیکن اب چونکہ ایک بار لکھ دی گئی، اس لئے خیر —— ! گاہک کو اس کا پورا پورا فائدہ پہنچنا چاہیئے" وغیرہ وغیرہ۔

کباڑی کی دوکان کو صحیح معنی میں دوکان نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اکثر کباڑی کسی بند دوکان کے تختہ پر، کسی پھاٹک، کنوئیں کی من پر، مسجد یا مندر کی سیڑھیوں

پر، یا اسی قسم کی کسی دوسری جگہ اپنا کباڑخانہ کھولے بیٹھا رہتا ہے۔ کباڑی کی دوکان کیا ہوتی ہے "عشق کے ماروں کا فسانہ" کہ "سمٹے تو دلِ عاشق" بن جائے اور چھوٹے سے صندوق میں سما جائے اور "پھیلے تو زمانہ" بن جائے، اور ریگ بھر زمین گھیرلے۔ دوکان عام طور پر علی الصبح کھل جاتی ہے اور دن چھپنے سے پہلے بند ہو جاتی ہے۔ کباڑی دراصل "مرغ کے ساتھ بیدار ہوئے اور چڑیا کے ساتھ بسیرے" کا قائل ہوتا ہے۔ وہ کباڑی نہیں جو باقاعدہ دوکان پر بیٹھے۔ کباڑی زیادہ تر دوکان بردوش ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی دوکان خوب "چلتی" ہے۔ اور دوکانیں صرف چلتی ہیں پھرتی نہیں ہیں۔ اس کی دوکان چلتی بھی ہے اور پھرتی بھی ہے۔

ہندوستانی کباڑی کی دوکان میں معمولاً اس قسم کی چیزیں دیکھنے میں آسکتی ہیں۔ ٹوٹے کھوٹے لمپ جن میں کوئی مہرے کی بے مہری پر مرثیہ خواں ہے تو کوئی ڈِھبری کے غم میں گریہ کناں۔ پانچ چھ درجن زنگ آلود ڈبیا نوں کی کیلیں، چھوٹے بڑے پیچ، براس کاک، بے جوڑ چینی کی پلیٹیں، بے ڈھکنے کی چا،دانی نصف درجن فاونٹن پنوں کی لاشیں جن میں کچھ جسم بے سر اور کچھ سر بے جسد! جن کے سر اور جسم دونوں ہوتے ہیں، اُن کے زبان نہیں ہوتی کہ شکوہ بھی کرسکیں بعض صرف ڈھانچے ہوتے ہیں، ہڈی پسلی غائب! اندر سے کھوکھلے! دو چار لنگڑی میزیں، پانچ سات ہتی کرسیاں، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا کے

کرم خوردہ نسخے، چند پُرانی دھرانی تصویریں، ایک آدھ ٹائم پیس، جو وقت بتانے میں اتنی ہی مدد دے سکتی ہے جتنی تاریک رات میں دھوپ گھڑی۔

اس کباڑ خانے میں کبھی کبھار بھولی بھٹکی کوئی کام کی چیز بھی نکل آتی ہے جس کے باعث بعض لوگ کباڑی کی دوکان سے سچے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کسی نئے شہر میں جا کر اُن کے اندر سب سے پہلے کباڑی کی دوکان تک پہنچنے کی ایسی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسے لوگوں کا معیار اس قدر آفاقی ہو جاتا ہے کہ پُرانی چیزوں کے مقابلہ میں نئی چیزیں اُن کی نگاہ میں نہیں آتیں، خواہ قیمت میں زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اور جب تک وہ کباڑی کی دوکان سے کوئی ایسی چیز نہیں خرید لیتے جس کی قیمت نئی سے زیادہ ہو، اُس وقت تک اُن کے ذوقِ کباڑ پسندی کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ اسی میں فخر سمجھتے ہیں۔ ہر نئے آنے والے کو دکھاتے ہیں، اور پھر شاعر کی طرح اس کی داد بھی چاہتے ہیں۔ لیکن آج تک یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس ذیل کے کسی آدمی نے صحیح معنی میں کوئی عجیب "دریافت" کی ہو۔ اور کباڑی کی آنکھوں میں دُھول جھونک کے کوئی ایسی شے خرید لی ہو جو اصل میں بیش قیمت اور کباڑی سے سستی ہاتھ آ گئی ہو۔

اس میں کباڑی بے چارہ بالکل بے قصور ہے۔ ایسے لوگ ہاتھ نہ آئیں تو غریب پیٹ کا دوزخ کیسے بھرے۔ مگر اس کا کاروبار رشوت اور چور بازاری کی آلودگی سے پاک ہے۔ وہ نفع کماتا ہے ایمان نہیں بیچتا۔ حکومت ٹیکس لگائے

میونسپلٹیاں چنگی بڑھادیں، کباڑی کا کاروبار اس سے متاثر نہیں ہو سکتا امریکہ اور برطانیہ کے تجارتی فیصلے، ڈالر کی قیمت میں کمی بیشی، دول عالم کو ہلا سکتی ہے، کارخانہ داروں اور دوکانداروں میں بے اطمینانی پھیلا سکتی ہے، دنیا کے بازار میں تعطل پیدا کر سکتی ہے کباڑی کو ٹس سے مس نہیں کر سکتی۔ اس معاملہ میں کباڑی قطب مینار کا سا ثبات رکھتا ہے۔ آج کل اس تجارتی افراتفری اور کساد بازاری کے دور میں جب کہ دوکاندار رو رہا ہے کہ گاہک نہیں، گاہک چیخ رہا ہے کہ مال نہیں، مال چلّا رہا ہے بازار نہیں، کباڑی اپنے کام میں مصروف ہے، بازار پر جمود طاری ہے، ٹھالی بیٹھے ہاٹ بٹی ہار رہے ہیں، دوکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، مگر کباڑی کی دوکان پر اگلی سی چہل پہل ہے۔

ہمارے میر صاحب

ہمارے میر صاحب نسلاً تو جو کچھ سید ہیں۔ لیکن "میر صاحب" انھیں صرف خاص خاص لوگ کہتے ہیں۔ عام طور پر وہ "ڈاکٹر صاحب" کہلاتے ہیں جب اُنھوں نے نہ تو کبھی ڈاکٹری پاس کرنے کا جرم کیا، اور نہ وہ کبھی مطب کرنے کے خبط میں مبتلا ہوئے۔ حتیٰ کہ اُن بیچارے نے اُن ڈاکٹروں کی طرح جن کی شیشیاں دواؤں سے اور مطب مریضوں سے خالی رہتے ہیں، اپنے مکان پر کوئی چھوٹا موٹا سائن بورڈ بھی نہیں لگایا، پھر بھی لوگ اُنھیں "ڈاکٹر" کہتے ہیں۔ در اصل یہ ایک معمہ ہے جس کا حل شاید یہ ہے کہ چونکہ اُن کے والد ڈاکٹر تھے۔ اس لئے لوگوں نے "باپ پر پوت ......" والی مثل پر عمل کرتے ہوئے اُنھیں تھوڑا تھوڑا ڈاکٹر سمجھ لیا ہے۔ اُن کا آبائی وطن کہیں بھی ہو مگر یہاں اُن کے مکانات، باغات اور جائداد ہے

اُن کے والد نے ترکِ وطن کر کے اس قصبہ میں سکونت اختیار کر لی، اور اب شہر کا بچہ بچہ یہی جانتا ہے کہ میر صاحب یہیں کے رہنے والے ہیں۔

جس مکان میں رہتے ہیں اُن کا ذاتی مکان ہے جس کے دو حصے ہیں ایک میں مردانہ ہے، دوسرے میں زنانہ۔ زنانے حصے کے متعلق اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ اس میں ایک میٹھے پانی کا کنواں ہے جو پیاسوں کو سیراب کرتا ہے، مردانہ حصہ ایک مختصر مگر آرام دہ بیٹھک ہے جس کا صحن چھوٹا مگر خوش نما ہے۔ صحن کے اندر بے شمار گملوں میں رنگ۔برنگی پھلواریاں لگی ہوئی ہیں صحن کیا ہے ایک لالہ زار ہے جس سے برکھا رت میں میر صاحب پلنگ پر لیٹ کر گھر بیٹھے بہار کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ صحن میں ایک طرف بڑی سی چوکی بچھی رہتی ہے، جو بارش دھوپ اور آندھیوں میں ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ گرمی میں رات کی اور جاڑوں میں دوپہر کی نمازیں میر صاحب اسی چوکی پر پڑھتے ہیں۔ لیکن اسی چوکی پر بارہ مہینے پانی کے گھڑے رکھے رہتے ہیں، اور مکان میں چونکہ گھڑونچی نہیں ہے اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ یہی چوکی گھڑونچی بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چوکی جا نماز کم، اور گھڑونچی زیادہ ہے چوکی کے پاس قطب مینار کھڑا ہے، یعنی ایک طویل القامت تاڑ کا درخت جسے چھتیس سال پہلے خود میر صاحب نے بویا سینچا، اور پروان چڑھایا تھا۔ تاڑ کے اتنے سیدھے اور بلند درخت کمیاب ہیں، اب یہ آسمان سے باتیں کرتا ہے اور کچھ مدت میں آسمان میں تھیگلی لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

میر صاحب کا کمرہ جو ایک سہ دری ہے، ہمیشہ آراستہ رہتا ہے۔ اس میں دری اور قالین کا فرش تو نہیں ہے، البتہ چھت گیری بارہ مہینے لگی رہتی ہے، کرسیوں اور میز کی ترتیب میں موسمی تبدیلی کے علاوہ کوئی فرق نہیں آتا، یہ تبدیلی بس اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ بڑی میز کا جو شمالی دیوار کے پاس بچھی رہتی ہے، اُن کرسیوں سے جو پالسٹ میں رہتی ہیں، تبادلہ کرادیا جاتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس طرف زنانہ میں جانے کے لئے ایک دروازہ ہے جس سے گرمی میں ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ اس لئے نشست کا مرکز کوٹھری والی طرف سے اس کے مقابلہ والی دیوار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ دراصل میر صاحب یکساں رفتار سے چلنے کے قائل ہیں، اور تبدیلی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر وہ چیز جو پرانی ہے، مقدس ہے۔ وہ اس معاملہ میں "جان بل" کی سی خاصیت رکھتے ہیں۔

بڑی میز پر ایک لمبا چوڑا میز پوش پڑا رہتا ہے جس کے تین چھور اتنے لٹکے رہتے ہیں کہ میز کے نیچے رکھی ہوئی چیزیں، تاوقتیکہ جھانک کر نہ دیکھا جائے، نظر نہیں آسکتیں۔ میز کے نیچے لیمپ، مٹی کے تیل کی بوتل، پینے کی تمباکو، اور کوئلوں کا اسٹاک جمع رہتا ہے۔ میز کے اوپر بیچ میں ایک پرانا مگر خوبصورت گلدان رکھا رہتا ہے جس میں ایک خاص قسم کی سوکھی گھاس، جسے لال پیلے اور سبز رنگوں سے رنگا گیا ہے، سجی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا آئینہ، کنگھا، کپڑے صاف کرنے کا برش۔ ایک عدد گردآلود قلم دان، جس میں ایک ٹوٹا پھوٹا قلم

بھی پڑا رہتا ہے۔ اور ایک علدہ پیڈ جس کے استعمال کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے، رکھے ہوئے ملتے ہیں، اس کے علاوہ ایک پرانی چال کا فرشی لیمپ۔ دو تین شیشے کے گلاس اور ٹمبلر اور کیپسٹن کے خالی ڈبے ہیں ایک سائز کی کٹی ہوئی جھاڑو کی سینکیں جمع رہتی ہیں جن سے خلال کا کام لیا جاتا ہے۔

میز کے اوپر والے بڑے طاق میں ایک پرانا دقیانوسی گھنٹہ ہے۔ خود میر صاحب کے قول کے مطابق اس گھنٹہ کے انجر پنجر سب ڈھیلے ہیں۔ مگر وقت بتانے میں نئی چال کی فیوری لیوبا اور ویسٹ انڈ کی قیمتی اور نازک گھڑیاں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ میر صاحب اور اس گھنٹے میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً میر صاحب ایک "قطب" ہیں تو یہ گھنٹہ "سوا قطب" ہے۔ میر صاحب "جہاں دیدہ" ہیں تو گھنٹہ "زماں دیدہ" ہے۔ میر صاحب بوڑھے ہونے کے باوجود بوڑھے نہیں لگتے۔ تو یہ گھنٹہ بھی پرانا ہونے کے باوجود ٹھیک وقت بتاتا ہے میر صاحب کی چال میں سلامت روی اور زندگی میں یکسانی پائی جاتی ہے تو گھنٹہ بھی اسی کا دعویدار ہے۔ المختصر اگر میر صاحب اور گھنٹہ میں ما بہ الاشتراک باتوں کا توازن کیا جائے تو یہ طے کرنا مشکل ہو جائے گا کہ خصوصیات کے اعتبار سے کون ایک دوسرے سے افضل ہے۔ لیکن گھنٹہ بہر حال گھنٹہ ہے اور معمولی نہیں، مالک اس کے میر صاحب ہیں۔ اس لئے فوراً یہ چھری اور خربوزے کا مضمون بن کر میر صاحب کی فضیلت پر ختم ہو جاتا ہے۔

کمرے کی عقبی دیوار کے درمیان ایک لمبی الماری ہے جس میں ہمیشہ تالا پڑا رہتا ہے۔ اس الماری کو کھلتے نہیں دیکھا گیا۔ نہ جانے اس کے اندر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالی کھو گئی ہے یا پھر تالا جادو کا ہے "او کھل اوسم سم"! جیسے ساحرانہ بولوں کے زور سے صرف اس وقت کھولا جاتا ہے جب کوئی موجود نہیں ہوتا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ الماری کے اندر خفیہ اور راز کی چیزیں مثلاً پرانی اور مقدس دستاویزات، مقدمات کی مثلیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پوشیدہ رہتی ہیں۔

اسی قسم کی ایک چھوٹی سی الماری اسی دیوار کے جنوبی گوشے میں لگی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ چند سال پہلے تک اس میں بھی اسی قسم کا تالا پڑا رہتا تھا، جو اب کھول دیا گیا ہے۔ یہ چھوٹی الماری اپنے پچھلے جنم میں طاق رہی ہوگی جس نے کواڑ لگ جانے سے الماری کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس الماری میں شطرنج کی بساط، مہرے، ایک آدھ تاش کی گڈی، جو کوٹ پیس اور رمی کھیلنے کے کام میں آتی ہے، اور ۱۹۲۸ء سے لے کر آج تک کی الیکشن کی فہرستیں محفوظ رہتی ہیں۔

کمرے کی بغل میں ایک کوٹھری ہے جو قد و قامت میں کلکتے کی کال کوٹھری سے کچھ بڑی ہے۔ لیکن میر صاحب کے لئے بیک وقت سونے، کھانے، اور کپڑے تبدیل کرنے کے متعدد کمروں کا کام دیتی ہے۔ سونے کی چارپائی اس میں پھنس کر آتی ہے، مچھر دانی بانسوں میں لگائے جانے کے عوض دیواروں میں کیلیں ٹھوک کر باندھی گئی ہے۔ مچھر دانی کے اندر لیٹ کر یقین ہے قبر کا لطف آتا ہوگا۔ مگر میر صاحب اس صورتِ حال سے بالکل

مطمئن نظر آتے ہیں۔ بکس چارپائی کے نیچے چھپے رہتے ہیں۔ ایک پوری دیوار کپڑے ٹانگنے کے لئے وقف ہے۔ ایک کونے میں پان دان پڑا رہتا ہے۔ سامنے والی دیوار سے لگی ہوئی ایک چھوٹی میز ہے جس پر پان سازی کا اسٹاک پھیلا رہتا ہے۔ اس کے اوپر کارنس پر سُرمہ دانی، صابن دانی، منجن کی ڈبیہ، خضاب لگانے کا بکس، خط بنانے کے سامان کا ڈبہ اور ایک "سنگِ اشرف" کا قلم دان جو اُن کے دادا جان کو انعام میں ملا تھا، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دَور کی یادگار ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا خاک دھول بھرا رہتا ہے۔

میر صاحب عادتاً وضع کے پابند ہیں۔ اب اُن کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ مگر اُن کی چھب سے پتہ چلتا ہے بیس پچیس سال پیشتر بڑے رنگیلے جوان رہے ہوں گے۔ شہر میں ترکی ٹوپی پہننے والے، اور وہ بھی تیر گول آپ تنہا رہ گئے ہیں میر صاحب کے پاس کئی کئی شیروانیاں اور کئی کئی جوڑ جوتوں کے رہتے ہیں۔ پاجامہ ہمیشہ چست پہنتے ہیں۔ جس میں نصف ساق تک چوڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ چوڑیاں نہایت باریک اور مہین ہوتی ہیں، اور بڑی احتیاط اور کاوش سے کافی وقت صرف کرنے کے بعد بنائی جاتی ہیں۔ اُن کے بعض احباب کو شکایت ہے کہ میر صاحب پاجامہ پہننے میں بہت وقت صرف کرتے ہیں۔ لیکن میر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ چست پاجامہ اتنے جلدی سٹ سے چڑھا سکتے ہیں کہ اعتراض کرنے والے اپنا ڈھیلا پائچہ اتنے جلد نہیں پہن سکتے۔ سیاہ شیروانی میں پتلی پتلی ہرن کی سی دو سفید ٹانگیں

اس طرح بر آمد ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کالے بادلوں میں بجلی کوندرہی ہے، اور اس پر سیاہ لیپ میر صاحب کو رشکِ جانِ عالم بنا دیتا ہے۔

میر صاحب کی مونچھیں نرالے کٹ کی ہیں۔ مونچھوں کو سنوارنے کا میر صاحب خاص اہتمام کرتے ہیں۔ چوتھے روز شیو کرنے کے ساتھ مونچھوں میں خضاب لگانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی وزیر کو پارلیمنٹ میں سوالوں کا جواب دینا۔ مونچھ دار حضرات واقف ہیں کہ مونچھوں کے کٹ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک وہ مونچھیں ہوتی ہیں جو چہرے کے ڈائل پر ہمیشہ گیارہ بج کر پانچ منٹ بجاتی ہیں۔ ایک وہ ہوتی ہیں جو سوا نو بجاتی ہیں۔ اور اتنی نوک دار اور سخت ہوتی ہیں کہ بے خیالی میں کسی کو چھو جائیں تو کھرچ کر رکھ دیں۔ اور باقاعدہ چبھوئی جائیں تو ہتھیار کا کام دیں اور سوراخ کر دیں۔ ایک وہ بیچاریاں ہوتی ہیں جو آٹھ بیس بجاتی ہیں اور اتنی گھنی ہوتی ہیں کہ ان پر مصنوعی ہونے کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ میر صاحب کی مونچھیں منفرد ہیں۔ دراصل اُن کی مونچھوں میں یہ تینوں قسمیں بہ یک وقت پائی جاتی ہیں۔ یعنی اُن کی مونچھیں دہن کے آس پاس لبوں سے آٹھ بیس والے زاویے سے اُتر کر ایک خوب صورت دائرہ بناتی ہوئی گیارہ پانچ والی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر آپ نے قیصرِ جرمنی کی تصویر دیکھی ہے جو دوسری اچھی اچھی تصویروں کے ساتھ اُن کے کمرے میں آویزاں ہے تو سمجھ لیجئے آپ کو اُن کی مونچھوں کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ غالباً مونچھ کی روش میر صاحب نے قیصرِ جرمنی سے حاصل کی ہے۔ میر صاحب کی مونچھیں اور جنبل نہ سہی، بہر حال

سرقہ بھی نہیں کی گئی ہیں۔ انھوں نے قرینے کے ساتھ ماخوذ کرکے انھیں اس طرح اپنا لیا ہے جس طرح آغا جانی کاشمیری نے ٹینی سن کی "اینک آرڈن" کو۔

خود ان کے احباب میں کئی قسم کی مونچھیں رکھنے والے حضرات شامل ہیں بعض مغرب زدہ احباب ڈاڑھی مونچھ صاف رکھتے ہیں۔ ایک انگریزی داں دوست جو آخر الذکر فہرست میں شامل ہیں میر صاحب کے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہیں تو معاً چندر لیکھا کا وہ سین آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس میں جوگن نے چوری چوری محل میں گھسنے کے لئے دونوں دربانوں کو جن میں ایک مونچھ اور دوسرا بامونچھ تھا اور جو شطرنج کھیلنے میں محو تھے اپنے حسن، گانے اور ناچ سے اتنا مسحور کر دیا کہ وہ چپکے سے اندر گھس گئی اور دربانوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔

میر صاحب کا دائرۂ احباب خاصا وسیع ہے۔ یہ دائرہ عمر، مذاق نسل، پیشے اور روپیہ پیسے کی اونچ نیچ سے بیگانہ ہے۔ ان کا اخلاق اتنا وسیع ہے کہ ان اوقات کے سوا جب وہ دن رات میں سوتے یا باہر ہوتے ہیں ان کی محفل چوبیس گھنٹہ گرم رہتی ہے۔ شام ہوئی اور پروانے گرنے شروع ہوئے جیسے لوبان سلگا اور مردے آئے۔ رات کی بزم مخصوص ہوتی ہے۔ اس بزم میں چند ایسے حضرات بھی شریک ہوتے ہیں جو عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں کانگریس کے بڑے بڑے عہدہ دار، میونسپل کمشنر، ایم، ال، اے وکیل، تعلیم کے افسر، تھانہ دار، تحصیلدار سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ ایک صاحب جو انگریزی کپڑے پہننے کے شوقین ہیں،

اچھے خاصے ”موٹے گوپ“ کا نمونہ ہیں۔ ایک صاحب خواہ مخواہ کوبڑ نکال کر چلتے ہیں۔ ایک تیسرے صاحب صورت شکل میں اچھے خاصے ہیں مگر اُن کا داہنا ہاتھ بیکار ہے۔ اور کورٹ پیس کھیلتے ہیں جب اُن پر پیس جمتی ہے تو کھیلنے والوں کو خاصی اُلجھن ہوتی ہے، ایک اور صاحب ہیں اُن کی آنکھوں کا زاویہ ذرا ترچھا گرتا ہے باقی سب ٹھیک ہے۔ ایک صاحب نے خاصی بھلی صورت شکل پائی ہے مگر وہ اتنے پستہ قد اور گول مٹول ہیں کہ اُن کی چال پر تربوز کے لڑھکنے کا شبہ ہونے لگتا ہے ایک صاحب کا اور کچھ نہیں تو سر ہی تابنا ہے۔ میر صاحب کو چھوڑ کر ان کی بزم میں ایک صاحب بھی تو ایسے نہیں جو بے عیب ہوں، اور جب یہ سب حضرات جمع ہوتے ہیں تو کمرہ عجائب گھر بن جاتا ہے۔

جن لوگوں نے میر صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا وہ یہی جانتے ہوں گے کہ میر صاحب کا کام دن بھر آرام کُرسی پر پڑا رہنا ہے اور بس۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب اُن کے مکان کا صدر دروازہ کھُل جاتا ہے اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے تو میر صاحب پورے ”قطب“ ہو جاتے ہیں۔ وہ دن رات میں چار بار کرسی سے اُٹھتے ہیں۔ دو بار کھانا کھانے، اور دو بار نماز پڑھنے اور اسی میں حوائجِ ضروری سے فراغت کے لئے وقت نکل آتا ہے۔ لیکن میر صاحب نکمے نہیں ہیں۔ اُن کی شیروانیاں ہمیشہ صاف ستھری ہوتی ہیں جنھیں وہ اپنے ہاتھ سے برش کرتے ہیں۔ اُن کے جوتے ہمیشہ چمکدار اور صاف ہوتے ہیں جنھیں وہ خود پالش لگاتے ہیں۔ اُن کی

ڈبیہ ہمیشہ پانوں سے بھری رہتی ہے جو وہ خود بنا کر رکھتے ہیں۔ صبح شام ڈیڑھ گھنٹہ پان سازی اور اس کے لوازم کے لئے وقف ہے۔ پانوں کی ڈبیہ کرسی کے ہتھے پر رکھی رہتی ہے۔ خاص خاص مہمانوں کو پان وہ خود پیش کرتے ہیں، لیکن بے حیا لوگ بے تکلفی کی آڑ میں خود اٹھا کر کھا لیتے ہیں۔ اس میں میر صاحب بے قصور ہیں۔ ان تمام باتوں سے میر صاحب کی نفاست پسندی، سلیقہ مندی اور وضع داری کا پتہ چلتا ہے۔

میر صاحب علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں، ویسے تو وہ ہر معاملہ میں وقت کے پابند ہیں لیکن کھانا کھانے کے معاملے میں وقت کی پابندی شدت اختیار کر گئی ہے۔ اور بعض احباب کی طبیعت کے بالکل منافی ہونے کے باعث وہ سخت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ صبح دس بجے اور شام کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے میر صاحب کے لئے کھانا کھا لینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا دفتروں اور اسکولوں کے لئے دس بجے کھل کر چار بجے بند ہونا اسی لئے دعوتوں میں پھنس کر میر صاحب کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ کھانا ہمیشہ کوٹھری میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ رات کو کھانے کے وقت لیمپ سہ دری سے اٹھا کر کوٹھری کے در میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس وقت لیمپ کوٹھری کے در میں ٹنگا ہو تو دور سے سمجھ لینا چاہئے میر صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔ میر صاحب شوقیہ طور پر کھانا خود بھی پکاتے ہیں۔ ہر مہینہ "بھائی چارہ" کے موقعہ پر ان کی اس عجیب و غریب صلاحیت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ جس میں میر صاحب اول درجہ حاصل کرتے ہیں۔ میر صاحب کی بنائی ہوئی پڈنگ سارے شہر میں مشہور ہے۔

میر صاحب کو اگر تھوڑی دور جانا ہوتا ہے تو تیاری میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے، اور اگر سفر کہیں مراد آباد کی دوری کا ہوتا ہے تو تیاری کی مدت اسی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ دوری کے ساتھ تیاری کی مدت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جب میر صاحب شکار کو جاتے ہیں تو تیاری اس قدر مفصل پیچیدہ اور طویل ہو جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے میر صاحب حج کو جا رہے ہیں۔ ایسے اوقات میں "اپنے" میر صاحب پر شوکت تھانوی والے "بٹیر باز" میر صاحب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

پھلواری اور شطرنج کے علاوہ میر صاحب کو شکار کا بھی بہت شوق ہے۔ جو بدقسمتی سے اب "لیسنس ضبط" ہونے کی وجہ سے بالکل ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

میر صاحب کو زنانے میں آتے جاتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لیکن اُن کے اولاد ہے جو ماشاء اللہ قابل رشک حد تک سعادت مند ہے۔ بچے جیسے اُن کے حکم کے منتظر رہتے ہیں کہ اُدھر آواز دی اور اِدھر موجود ہوئے۔ بعض کام ایسے ہیں جن کے لئے حکم کی بھی احتیاج نہیں، مثلاً لیمپ سرِ شام سے بغیر کہے جلا دیا جاتا ہے، کھانے کے لئے پکارا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کھانا لے آؤ، بلکہ یہ اطلاع دینا ہوتا ہے کہ نماز ختم کر دی گئی، اور کھانا آ جاتا ہے۔

خدا نظرِ بد سے بچائے میر صاحب اخلاق و اخلاص کا مجسمہ ہیں۔ اُن کی صحبت، آداب و عادات پر مکمل سبق کی حیثیت رکھتی ہے میر صاحب کی بزم افسردہ

دلوں میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ جتنی دیر وہاں رہتے فضا میں مہربانیوں اور مسرتوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اُن کی مونچھوں کے نیچے چھپی ہوئی ہلکی ہلکی مسکراہٹیں فلک شگاف قہقہے، اُن کا ذاتی اخلاق، اندازِ تکلم، عالی ظرفی، خودداری یہ سب باتیں ایسی ہیں جنھوں نے لوگوں کا دل موہ لیا ہے۔ اسی لئے شہر میں میر صاحب کے اتنے اثرات ہیں کہ جس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتے ہیں ممبر بن جاتا ہے۔ وہ گھر سے باہر خورد بینی مقدار میں نکلتے ہیں۔ وہ گھر بیٹھے مُہرے لگانے اور چالیں چلنے کے عادی ہیں۔ اُن کی سیاسی سمجھ بوجھ اگرچہ مقامی سہی مگر اتنی دور اندیشانہ ہوتی ہے کہ نوخیز سیاست داں اُن سے سبق لیتے ہیں۔ الیکشن کے ماحول میں اُن کی بیٹھک الکشن بازوں کا اڈّا، اور امیدواروں کا دفتر بن جاتی ہے۔ میر صاحب کا شمار شہر کے سربرآوردہ حضرات میں کیا جاتا ہے۔ کوئی دعوت، پارٹی یا محفل بغیر میر صاحب کے نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب دراصل پُرانی تہذیب، پُرانی وضع قطع اور زمیندارانہ ٹھاٹ کے آخری نمونہ رہ گئے ہیں۔ خدا کرے جیتے رہیں۔

ابّا جان کی کھیتی

ہمارا شبہ یقین میں بدل گیا جب ابّا جان نے آتے ہی نوکر کو حکم دیا کہ ایک ایک پلیٹ فلاں فلاں کو دے آئے۔ ہانڈی تیار ہو چکی تھی، اور چونکہ امّی روٹی پکا رہی تھیں اور سالن اُتارنے والا کوئی دوسرا نہ تھا، اس لئے ابّا جان نے جلدی اور گھبراہٹ میں سالن اُتارنے کا کام عمر میں پہلی بار خود انجام دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آدھا پلیٹوں میں گیا اور آدھا فرش کے حصہ میں آیا۔ پھر بے چینی سے اس انتظار میں کہ کب روٹی پک چکے اور کب کھانا شروع ہو، اُنھوں نے پیٹھ پر ہاتھ باندھ کر اپنے مخصوص انداز میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ فرطِ شوق میں آج وہ کبھی کبھی چٹکیاں بھی بجاتے یا گنگنانے لگتے، یا تھوڑی دیر بعد امّی سے پوچھ لیتے: "اب کتنی

روٹیاں رہ گئیں؟"

ہماری گھریلو زندگی کا آج ایک غیر معمولی دن تھا۔ دراصل آج ہمارے ابّا جان کی "کھیتی" کا کدو پکایا گیا تھا۔

ہمارے ابّا جان کا شمار اُن لوگوں میں ہے جو ہمیشہ "دست بدہن" رہتے ہیں۔ کھیتی باڑی سے اُن کی طبیعت کو کوئی خاص لگاؤ نہیں اور زراعت سے اُن کا تعلق بس اتنا سمجھنا چاہیے جتنا سیٹھ ـــــ کا آئنسٹین کے نظریۂ اضافیت سے، لیکن اس معاملہ میں اُنھوں نے کچھ اپنے اقتصادی حالات کے تحت اور کچھ قومی جذبہ میں ایسے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جس کی توقع کم تھی۔

غرض غلّہ اگاؤ کی اُنھیں کچھ ایسی چڑھی کہ بغیر پس و پیش کے اُنھوں نے طے کر لیا کہ گھر کا ایک مربع انچ بھی ایسا نہ چھوڑا جائے جس میں کچھ نہ کچھ بویا نہ گیا ہو۔ نہ صرف زمین پر بلکہ آسمان پر بھی بویا جائے۔ یعنی گملوں میں، مٹّی کے تیل کے خالی پیپوں میں، ناندوں میں، ہانڈی چپن میں، حتیٰ کہ مکان کی چھتوں کو بھی معاف نہ کیا جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے دوسرے انتظامات کرنے کا بھی فیصلہ کیا مثلاً یہ ہفتہ میں کم از کم ایک بار ایک وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے، یا روزانہ دونوں وقت کم کھایا جائے یا روٹیاں ہر ایک کو گن گن کر دی جائیں، جو پہلے چار روٹیاں کھاتا تھا وہ اب صرف تین پر اکتفا کرے، یا مثلاً ہفتہ میں ایک دو دن ایسے بھی آئیں کہ گھر میں روٹی کا نام ہی نہ آئے اور اس کی بجائے شکر قندیں، آلو،

یا اسی قسم کی دوسری چیزوں سے پیٹ کا دوزخ بھر لیا جائے۔

چنانچہ مکان کے صحن میں ترکاریاں بونے کے انتظامات نہایت سرگرمی سے شروع کر دیئے گئے۔ لیکن کوئی ہفتہ بھر تک کھیتی پر آبا جان کا چونچلا رہا اور رفتہ رفتہ شوق کا پارہ کم ہوتے ہوتے صفر پر آگیا انجام یہ ہوا کہ ٹماٹر جل بھن کر خاک ہو گئے۔ ساگ شلجموں کو کیڑا لگ گیا، مرچوں کے پودے نہ جانے بانجھ تھے کہ بے اولادے رہ گئے۔ آلوؤں سے البتہ گھر بھر گیا ہوتا مگر اس میں امی کی غلطی کہ نول بیٹھیں، کل ـــــ سوا سیر نکلے، اُن میں بھی کچھ گلے ہوئے، اور کچھ اتنے ننھے کہ منا اُن سے گیند کا کام بھی تو نہ لے سکتا تھا۔

خیر یہ پہلا تجربہ تھا، اگلے سال اس سے زیادہ شد و مد کے ساتھ اور وطن پرستی کے پورے جذبے میں کام شروع ہوا۔ اس مرتبہ ترکاریوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا۔ کدو اور توری کے بیج بوئے گئے اور اُن کی بیلوں کو منڈھے چڑھانے کا مناسب انتظام کیا گیا۔ پانی دینے کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ گھر میں چونکہ نل نہ تھا اس لئے دو روپے ماہوار پر بھشتی کا بھتہ مقرر کر دیا گیا۔ جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے تو بچوں کو یہ الٹی میٹم دے دیا گیا کہ کیاریوں کے قریب نہ جائیں ورنہ جان سے مار دیئے جائیں گے۔

پودے بڑی تیزی سے اُبھرنے لگے اور ہفتہ عشرہ میں بیلیں بھی چل پڑیں۔ برسات آئی تو گھر بھر میں ہریالی چھا گئی۔ آبا جان کے الفاظ میں گھر میں کتنی "رونق"

تھی۔ مگر میرے نزدیک گھر بن معلوم ہوتا تھا اور اس قدر اداسی اور وحشت برستی تھی کہ خدا بچائے۔ اس "رونق" کی قیمت سارے گھر والوں کو ادا کرنی پڑی۔ جھینگروں کی سمع خراش آوازوں اور ہر وقت کے سانپ بچھوؤں کے خطرے نے راتوں کی نیند حرام کر دی اور دل کا چین چھین لیا۔ پھر چارپائی کے کھٹملوں نے بھی اپنے فرائض میں کوتاہی کرنا خلافِ شان سمجھا۔ سبزیوں کی کثرت سے مچھروں کی آبادی میں اضافہ ہو گیا اور ملیریا نے حملہ بول دیا اور ہم سب ایک ایک کر کے بیمار پڑے۔ ہُو! ہا! کے فلک شگاف نعروں سے سارا گھر گونج اُٹھا۔ کونین کی خوشگوار خوراک نے منھ کا ذائقہ درست کر دیا۔ سب سے پہلے بیماری کا شکار مُنا ہوا، پھر میں۔ لیکن کھیتی کا اصلی مزہ اُس وقت آیا جب امی بیمار پڑیں اور گھر والوں کو روٹیوں کے لالے پڑے۔ ابا جان کی باری سب کے بعد میں آئی، مگر اُنھوں نے اُف نہ کی، اور فاقے کر کر کے اپنے اس قول پر پورے اُترے کہ "کم کھانا اور غلہ بچانا ہر ہندوستانی مرد اور عورت کا فریضہ ہے۔" کم کھانے کے لئے اُن کی ہر وقت کی تلقین خود اُن کے آگے آئی جیسے بوڑھے لکڑہارے کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی ہو۔ مگر ابا جان نے لکڑہارے کی طرح اُس سے یہ نہیں کہا، "بوا بخشو! میں نے تمھیں لکڑیوں کا گٹھا اُٹھوانے کے لئے یاد کیا تھا۔

پھر ایک دن آیا کہ بیلوں میں پھل آنے لگے۔ پھلوں کے بوجھ سے کھمبوں کا کمزور ٹھاٹ بوجھ مرنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک دن حکیم صاحب

آنکلے جو ابا جان کے پرانے دوست تھے اور اس دن انھوں نے ہمارے ہی یہاں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ابا جان نے انھیں کھیتی کی سیر کرائی، ٹماٹر دکھائے، مرچوں کی کیاری دکھائی، ساگ شلجموں کا معائنہ کرایا، مکئی کے قدِ آدم پودے سروں پر بھٹوں کا تاج رکھے بڑی شان سے لہلہا رہے تھے۔ اور حکیم صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر کدو کی بیل کے قریب پہنچے جس میں بے شمار کدو لگ رہے تھے۔ چھوٹے بڑے، درمیانی، ہر قسم کے۔ بیل کے نزدیک پہنچ کر حکیم صاحب ذرا ٹھٹکے اور چلتے چلتے یک لخت اس طرح رک گئے جیسے خدانخواستہ کوئی وحی نازل ہوئی ہو۔

"آخاہ! یہ آپ کے ہاتھ کہاں سے لگا؟ یہ تو عجیب و غریب پھل ہے!" انھوں نے تعجب کے ساتھ استفسار کیا۔ اور پھر ایک پھل کا اچھی طرح معائنہ کر کے، "یہ تو وہ —— معلوم ہوتا ہے" اور انھوں نے ایک عجیب سا نام لیا جو ہم تو ہم ابا جان نے بھی کبھی نہ سنا ہو گا۔

"جی ہاں! جی ہاں!!" ابا جان نے ذرا گھبرا کر اپنے جواب میں بے ساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور پھر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اس حقیقت سے پہلے سے ناواقف نہیں تھے۔ اپنی کمزوری کو چھپانے کی ناکام کوشش میں اپنے کاندھوں کو ہلکی سی جنبش دی، داہنے ہاتھ سے خالی ناک صاف کی، دوسرے

ہاتھ سے ہمیں دور ہٹنے کا اشارہ کیا اور پھر بڑے پیار سے "جاؤ بیٹا ذرا پان تو لے آؤ" کہہ کر ہمیں ٹالنے کی کوشش کرنے لگے۔

"آپ بھی کیا آدمی ہیں!" حکیم صاحب نے ابّا جان کا حوصلہ بڑھایا، "کہ یہ پھل بور کھا ہے اور کہتے نہیں! اس کی خوبیاں مجھ سے پوچھئے! اس کے بیج بیماروں کے کام آتے ہیں اور عطّار ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے ہیں۔ سپیرے اسی کی بین بناتے ہیں! اور آپ جانتے ہیں بین سے مجھے بھی شوق ہے، پھل اُتریں تو ایک ——"

"بے شک! ضرور ضرور!" ابّا جان نے حکیم صاحب کو لقمہ دیتے ہوئے وعدہ کیا اور وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ حکیم صاحب نے اُن کی بات کاٹ دی۔

"اے صاحب نادر شے ہے نادر! میں تو عرصہ سے اس کی تلاش میں تھا" یہ کہہ کر اُنھوں نے گویا ابّا جان کے اطمینان و مسرت پر مُہر لگا دی۔ دوست کو رخصت کرنے کے بعد ہمارے سامنے یہ اعلان پھر دوہرایا گیا اور دوگنے زور کے ساتھ، کہ بیل کے نزدیک بھول کر بھی گئے تو یاد رکھنا "ٹھوک مار دیئے جاؤ گے!"

"سنتے ہو تم لوگ!" ابّا جان نے ہمیں دھمکایا، "تم دونوں میں سے کسی کو بھی اُدھر دیکھا تو سمجھ لو بستر پر نظر آؤ گے" اس اعلان سے بیل کی

عظمت ہماری نگاہوں میں دوبالا ہوگئی۔ اس "شجرِ ممنوعہ" کے قریب جانا تو درکنار اس کی طرف رُخ کرنے سے ڈر لگنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کے تصور سے بھی رواں رُواں کانپ اُٹھتا۔ کدو کی بیل ناگن کی طرح اتراتی، بل کھاتی، پیچ در پیچ کھپچیوں کے ٹھاٹ پر بڑے ٹھاٹ سے چڑھ گئی تھی، وہ سب پودوں سے الگ تھلگ "چمن" کے اہم ترین مقام پر کچھ اس طرح کھڑی تھی جیسے واقعی وہ کوئی عجیب اور عظیم ہستی تھی جس کی عزت کرنا ہم سب کا فرض تھا۔ مریم پارسا کو جیسے اپنی رفعت و عالی مقامی کی بشارت دے دی گئی ہو۔ اور جب ابا جان کی لال پیلی آنکھیں اور بگڑے بگڑے تیور یاد آجاتے تو ہم ڈر کے مارے سہم جاتے۔ جب بڑھتے ہوئے کدو ابا جان اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو پھولے نہ سماتے۔ اگر سارے گھر کو ایک دفعہ چور بھی لوٹ کر لے جاتے تو ابا جان کا یہ نقصان اُن کی بیل کے نقصان کے مقابلہ میں بے حقیقت ہوتا۔

آخر کار وہ دن بھی آگیا کہ ابا جان نے اپنی جیب سے اپنا خوبصورت چھوٹا سا چاقو نکالا اور بڑی احتیاط سے چار پھل کاٹے۔ نہایت حسین، سڈول، بالکل بے داغ! بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا، "کیا کہنا ماشاء اللہ! اے دن ہے اے دن! اور فوراً یہ محسوس کر کے کہ وہ کس سے مخاطب ہو گئے، وہ تیزی سے امّی کی طرف لپکے۔

"دیکھئے ہماری کھیتی کے کدو!" وہ ہر آنے والے کو متوجہ کرتے اور پھر اُن کی تعریف کے پل باندھ دیتے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی کھیتی کی تاریخ، اپنی

محنت اور جفاکشی کے کارناموں اور اس کے متوقع فوائد پر اس قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے کہ سننے والا عش عش کرتا جاتا۔ القصہ ابا جان کے احکامات صادر ہو گئے کہ ان میں سے ایک کو آج ہی پکایا جائے، دو دوستوں میں بھیج دیئے جائیں اور باقی ایک کو آئندہ کے لئے رکھ چھوڑا جائے۔

نیچے ہمارے دو کدو باہر والے بڑے طاق میں کچھ اس طرح پاس پاس پڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا گلے میں باہیں ڈالے ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہیں اور آنے والے خطرے سے ایک دوسرے کو آگاہ کر رہے ہیں۔ اتنے میں شامت اعمال سے بیچارہ منا ادھر جا نکلا اور فوراً ابا جان نے اُسے ڈانٹ پلائی، "کہاں کھڑا ہے مردود! گرائے گا انھیں! ہٹ ادھر سے!" اور امی مجھ پر برس پڑیں اور ہم دونوں کو سینکڑوں سُنا ڈالیں۔ اتنے دنوں سے کدو ہمارے لئے وبالِ جان بن رہے تھے لیکن اس وقت ان کا سارا ذائقہ کرکرا ہو گیا۔ اگر اس وقت ہم سے کوئی پوچھتا، "کدو کیسے ہیں؟" تو ہم فی البدیہہ جواب دیتے۔ "برے!" لیکن ہمارے برا کہنے سے وہ برے تھوڑا ہی ہو سکتے تھے۔ ان پر تو سارا گھر جان دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد رات کے کھانے کے لئے ایک کدو کو ذبح کر ڈالا گیا تو اس کا ساتھی اکیلا پڑا حسرت سے اُسے تکتا رہا اور ہم دل ہی دل میں اس کا منھ چڑاتے رہے۔

کھانا پکانے کے انتظام میں آج ابا جان نے بنفسِ نفیس شرکت کی، آج وہ

دفتر سے بھی سویرے لوٹ آئے۔ اپنے ہاتھ سے بیٹھ کر کدو تراشا۔ اسی خوبصورت چاقو سے جسے وہ ہمیشہ اس قسم کے اہم موقعوں پر استعمال کیا کرتے تھے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اصلی گھی منگایا گیا۔ امی نے ناپ تول کر بڑی احتیاط سے مسالے ڈالے اور پکتے میں بار بار دیکھتی رہیں۔ مبادا کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے۔ ابا جان کے لئے انتظار کی گھڑیاں کاٹنی دو بھر ہو گئیں اور وہ کہیں ٹہلنے نکل گئے۔ ہو سکتا ہے اپنے اُن دوستوں میں پہنچے ہوں جنھیں صبح تحفے میں کدو بھیجے تھے۔

کھانا بڑی احتیاط سے اُتارا گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ابا جان، امی اور ہم دونوں کھانا کھانے بیٹھے پہلے بچوں سے ابتدا کی گئی جب ہم نے دیکھ لیا کہ کھانا چُنا جا چکا اور امی نے ہمیں شروع کرنے کے لئے اشارا کر دیا تو مُنے نے لقمہ توڑا اور سالن کی رکابی میں ہاتھ ڈال دیا، میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ابا جان ابھی کدو کے خیالی ذائقوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہماری زبانیں اُس کے ذائقہ سے آشنا ہو گئیں۔ میں نے لقمہ کو چبانے کی ناکام کوشش کی۔ مگر جیسے کسی نے منھ سی دیا ہو۔ مُنا زیرِ لب مسکرایا۔ پھر ہم دونوں میں آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ مگر مُنا زیادہ دیر ضبط نہ کر سکا۔

"آخ تھو!!!

بے قابو ہو کر اُس کی آواز نکل پڑی۔

اِدھر میں نے چھپا کر لقمہ تھوکا اور چپکے چپکے ابکائیاں ل

لینی شروع کیں۔

ابا جان ——— سر پکڑ کر بیٹھ گئے —— اور

امی ——— !

امی دوسرے سالن کے انتظام میں لگ گئیں

آزادی میں پابندی

آج کے اخبار میں یہ اعلان پڑھ کر کہ اس زمانے میں سڑکوں پر پیش آنے والے حادثات کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ معاً میری نگاہوں میں اگست ۴۷ء کے بعد کا ایک واقعہ پھر گیا۔ نوعیت کے اعتبار سے واقعہ بہت معمولی تھا۔ ایک بڑی بوڑھی، بھاری بھرکم خاتون، ہاتھ میں پھلوں کی ڈلیہ لٹکائے چاندنی چوک کے بیچوں بیچ، اپنے گرد و پیش سے بے خبر، خراماں چلی جا رہی تھیں۔ ٹریفک کی بے چینی اور خود مسماۃ کی جان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے بڑی بی کے قریب جا کر نرمی سے کہا، "مائی جی! پیدل چلنے والوں کے لئے وہ چبوترہ ہے اس پر چلئے۔" اور اس پر بڑی بی نے جھلا کر مجھے جواب دیا: "بڑے آئے مجھے ٹوکنے والے، ہم جہاں چاہیں چلیں، اب ہم آزاد ہیں۔"

بڑی بی نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ وہ انفرادی اور اجتماعی آزادی کا مفہوم اور دونوں کا باہمی فرق اچھی طرح نہ سمجھتی تھیں، وہ شاید یہ نہ جانتی تھیں کہ جس آزادی کے ذریعہ سے اُنھیں سڑک کے بیچوں بیچ چلنے کا حق پہنچتا ہے اُسی آزادی کے ذریعہ سے تانگہ والے کو اُس چبوترے پر تانگہ ہانکنے کا حق پہنچتا ہے جو پیدل چلنے والوں کے لئے مخصوص ہے، اور اگر یہ مان لیا جائے کہ آزادی اسی کا نام ہے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ دُنیا میں نظم وضبط، اور امن وسلامتی بے معنی الفاظ بن کر رہ جائیں گے۔ ہر ایک دوسرے کے راستے میں اٹکے گا اور کوئی بھی کہیں نہ پہنچ سکے گا۔ انفرادی آزادی سماجی لاقانونیت کی شکل اختیار کرلے گی۔

ہماری ڈلیا والی بڑی بی کی طرح آجکل بہت سے لوگ خاص کر ہندوستان والے، آزادی کا مفہوم بہت غلط سمجھتے ہیں۔ آزادی کے معنی یہ ہیں کہ تمام لوگوں کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کی آزادی میں تھوڑی تھوڑی کمی کردی جائے۔ چنانچہ بارہ کھمبے پر جب پولیس والا ہاتھ بڑھا کر آپ کی موٹر کو روکتا ہے تو یقین مانئے یہ کوئی غلامی کی علامت نہیں بلکہ عین آزادی کی دلیل ہوتی ہے، آپ اس شبہ میں ہرگز نہ پڑیں ہو سکتا ہے آپ کسی وقت جلدی میں ہوں اور پولیس والے کی اس بے جا مداخلت کو اپنی فطری آزادی کے منافی خیال کرلیں۔ واقعی ایک عام شاہراہ پر پولیس والا آپ کو روکنے والا کون ہوتا ہے؟ لیکن اگر آپ سنجیدگی سے غور کریں تو فوراً معلوم ہو جائے کہ اگر پولیس والا آپ کو نہ روکے تو پھر وہ کسی کو بھی

نہ روک سکے گا، اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ کناٹ سرکس ایک ایسے ہنگامہ پرور مقام میں تبدیل ہوجائے گا جس سے ہوکر گذرنا لوگوں کے لئے ناممکن ہوجائے گا۔ اس لئے آپ نے اپنی انفرادی آزادی میں تھوڑی سی کمی کو اس لئے گوارا کر لیا کہ آپ ایک ایسے سماجی نظام کا لطف اٹھا سکیں جو آپ کی آزادی کو حقیقی بنادے۔

آزادی کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ آزادی اصل میں ایک معاشرتی معاہدے کا نام ہے جو ایک دوسرے کی دلچسپیوں کو نباہنے کے لئے آپس میں کیا جاتا ہے، ایسے معاملات میں جن کا تعلق دوسرے کی آزادی سے بالکل نہیں ہے۔ میں جتنا بھی چاہوں آزاد ہو سکتا ہوں۔ مثلاً میں جانگیہ پہنے ننگ دھڑنگ سڑک پر پھرنے لگوں تو کسی کی مجال نہیں جو مجھے روک سکے۔ آپ کو آزادی حاصل ہے کہ آپ مجھ پر قہقہے لگائیں لیکن مجھے بھی آزادی حاصل ہے کہ میں آپ کی مطلق پروا نہ کروں۔ اگر مجھے بالوں کو خضاب لگانے اور خدانخواستہ مونچھوں کو گوند لگا کر تاؤ دینے کا شوق ہے یا پگڑی باندھنا پسند ہے یا خم پیچ کا انگرکھا اور کامدار جوتا بھاتا ہے یا سویرے سو کر دیر سے اٹھنے کی عادت ہے تو مجھے اختیار رہے مجھے کسی دوسرے کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے پوچھنے نہیں جاؤں گا کہ میں نے جو ارہر کی دال آج پکوائی ہے اس کے ساتھ پیاز اور ہری مرچ کا استعمال کروں یا نہ کروں اور نہ آپ اس معاملہ میں مجھ سے مشورہ طلب کریں گے کہ آپ کے لئے ہندو دھرم کو ماننا اچھا رہے گا یا بدھ مت کو، آپ کے لئے گوری لڑکی سے شادی کرنا ٹھیک رہے گا

یا کالی لڑکی سے، یا آپ میر کی شاعری پسند کریں یا غالب کی، یا آپ کو شطرنج کھیلنی چاہیئے یا پچیسی۔ یہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ اس معاملہ میں آپ اور میں مکمل طور پر آزاد ہیں۔

اس معاملہ میں اور اس قسم کے سینکڑوں دوسرے معاملوں میں ہم اپنی من مانی کر سکتے ہیں، اور ہمیں کسی دوسرے کی اجازت کی احتیاج نہیں۔ ہماری ایک جداگانہ سلطنت ہوتی ہے جس میں ہم تنہا حکومت کرتے ہیں۔ اس میں ہم جو چاہیں کریں، چاہے سنجیدگی اور معقولیت سے پیش آئیں یا بے ڈھنگا اور بے تکا پن اختیار کر لیں، چاہے ترشی سے کام لیں یا نرمی برتیں، چاہے اخلاق و آداب کا لحاظ رکھیں یا بے ادبی اور بداخلاقی پر اتر آئیں، کوئی ہمارا مزاحم نہیں ہو سکتا۔ لیکن جیسے ہی ہم اس سلطنت کے باہر قدم نکالتے ہیں، ہماری انفرادی آزادی دوسروں کی آزادی سے دوچار ہوتی ہے اور ہم اپنی آزادی میں کمی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے رات کے بارہ بجے سے صبح کے چار بجے تک گراموفون سننا پسند ہو، لیکن اگر میں لپنے مکان کی چھت پر لاوڈ اسپیکر لگا کر اپنا شوق پورا کرنے بیٹھ جاؤں تو پڑوسی جان کو آجائیں اور صبح سویرے سب سے پہلے مجھے آکر بتا دیں کہ بھائی صاحب آپ کی گراموفون سننے کی آزادی ہماری سکون کے ساتھ سونے کی آزادی سے ٹکرانی نہیں چاہیئے۔ دنیا میں طرح طرح کے آدمی رہتے ہیں اور مجھے اپنی آزادی کو اس طرح استعمال کرنا چاہیئے کہ میری

آزادی اُن کی آزادی میں خلل انداز نہ ہونے پائے۔

بدقسمتی سے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں یہ سب باتیں بھول جاتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ایک دقت یہ پیش آتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کا شعور رکھنے کی بہ نسبت دوسروں کی خامیوں کی گرفت کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔

ایک دن میں لکھنؤ کے لئے ریل میں سوار ہوا اور ایک کتاب کے مطالعہ میں اس طرح مصروف ہو گیا جس طرح طالب علم صرف امتحان کے نزدیک ہوتے ہیں۔ میں یہ کتاب تفریحاً نہیں پڑھ رہا تھا۔ میں دراصل مطالعہ برائے معلومات کا قائل ہوں، مطالعہ برائے تفریح کا قائل نہیں۔ میں ہمیشہ کتاب کو اس طرح پڑھتا ہوں جس طرح وکیل اپنے مقدمہ کی مثل کا مطالعہ کرتا ہے، کیونکہ اس سے میرا مقصد ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی کارآمد بات حاصل کروں۔ اب اگر آپ کوئی کتاب محض تفریح کے لئے پڑھ رہے ہوں تو آپکے پاس آکر کوئی ڈھول بھی پیٹے تو کوئی پروا کی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں "باسی پھول" اور "سمندر رو رہے" قسم کی کتابیں میں بھونچال میں بھی پڑھ سکتا ہوں۔

لیکن جب آپ کوئی کتاب برائے معلومات پڑھ رہے ہوں تو آپ کو سکون کی ضرورت ہے اور یہی وہ چیز تھی جو مجھے ریل میں سوار ہونے کے بعد میسر نہ ہو سکی۔ کیونکہ اگلے اسٹیشن پر دو صاحب ڈبے میں داخل ہوئے جن میں سے ایک شروع سے آخر تک برابر اپنے ساتھی سے بڑے زور زور سے باتیں کرنے میں مصروف رہے۔

یہ حضرت اپنے بارے میں کچھ غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ میں اپنی کتاب کے الفاظ اور مفہوم سے لڑتا رہا اور وہ صاحب طوفان میل کی طرح اپنے خاندانی امتیازات جنگِ آزادی میں اپنی قربانیوں اور ملک کے نیتاؤں کا تذکرہ اور اُن کے افعال و اعمال پر آزادی اور بڑے جوش خروش کے ساتھ نکتہ چینی کرتے رہے جس سے میرے مطالعہ کی کوششوں پر پانی پھر گیا۔ میں نے کتاب بند کر دی، کھڑکی کے باہر دیکھا اور بہ مجبوری اُن کی گفتگو پر کان لگائے جس کے بعض بول کچھ اس قسم کے تھے، "اب ہندوستان کے غذائی مسئلہ کو لے لیجئے۔۔۔ پنڈت جی کو یہ کرنا چاہئے۔۔۔ پاکستان کے مقابلہ میں ہم نے یہ غلطی کی۔ آپ جانتے ہیں کشمیر کے لوگ۔۔۔" میں یہ سب کچھ بہت پہلے سُن چکا تھا اور اکثر سنتا رہا تھا۔ میرے لئے یہ سب باتیں ڈھونڈو کی بھدی آواز اور بے وقت کی راگنی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھیں۔

اگر میں ان حضرت سے کہیں آہستہ بولنے کی درخواست کر بیٹھتا تو وہ مجھے فوراً بے ادب اور گستاخ گردان لیتے، وہ شاید یہ نہ جانتے تھے کہ ایک شریف آدمی کان پکڑ کر اُٹھک بیٹھک کرنے کو اُن کی بے مزا باتیں سننے پر ترجیح دے سکتا تھا اور مجھے یقین ہے جب وہ گاڑی سے اُترے تو اُنھیں یہی خیال ہوگا کہ اُنھوں نے اپنی وسیع معلومات اور فصیح و بلیغ خطبہ سے سارے ڈبہ والوں کو دانش و آگہی کا راستہ دکھا دیا اور یہ کہ سفر نہایت دلچسپ گزرا۔ وہ صاحب اچھے بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن بے چارے میں خرابی یہ تھی کہ اُن میں سماجی شعور کا فقدان تھا

اور وہ آداب مجلس سے ذرہ برابر واقف نہ تھے۔

اپنی روزمرہ زندگی میں دوسروں کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا ایک بڑی بات ہے اور سچ یہ ہے کہ یہی تمام اخلاق و آداب کی جڑ بنیاد ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا میں کتنے ایسے نکلیں گے جو اس معیار پر پورے اُتریں۔ تجربہ کرنا ہو تو ٹکٹ گھروں پر دیکھ لیجیے۔ اوروں کو دھکیل کر سب سے آگے بڑھنے والوں میں بڑی تعداد اُن خوش پوشوں کی ہوتی ہے جو بہ ظاہر شائستہ اور تعلیم یافتہ دکھائی دیتے ہیں لیکن اصل میں جاہل اور بے شعور ہوتے ہیں۔ دراصل اسکول اور کالج میں پڑھ کر سند لینا اور بات ہے اور آداب مجلس سیکھنا اور سماجی شعور اپنے اندر پیدا کرنا یہ دوسری بات ہے۔ جو لوگ درسگاہوں سے نکل کر یہ بات حاصل نہیں کر سکے میرے نزدیک علم و دانش کے دروازے اُن پر گویا ہمیشہ بند رہے۔ بڑے شہروں میں ٹکٹ گھروں اور اسی قسم کے دوسرے مقامات پر لائن لگانے کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات میں یہ اثرات نہیں پہنچے ہیں۔ پھر بھی ملک کے لئے ایک اچھی فال ہے۔

میں سمجھتا ہوں سیدھے سادے عام راہگیروں کے احساسات کا پاس و لحاظ رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ جب میں سڑک پر اس بے سُرے اور دل خراش ہارن کی کرخت آواز سنتا ہوں جو بعض موٹر والے عمداً استعمال کرتے ہیں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے اور میرے اندر غصہ اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں، جناب والا، آپ کو عام شاہراہوں پر ایسی دُرشت آواز کے ذریعہ سے اُن لوگوں کے جو آپ کے راستے میں آتے ہیں، کان پھاڑنے کی کس نے اجازت دی؟ کیا آپ اپنی آمد کا اعلان شریفانہ انداز میں نہیں کر سکتے؟ اپنے راستے سے دوسروں کو ہٹانے کی بجائے کیا آپ خود نہیں بچ سکتے؟ کیا آپ کوئی خاص آدمی ہیں یا آپ صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ آپ حضرت نطشے کے "مافوق البشر" ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے اُن لوگوں پر جو اس بھونڈے انداز میں غصہ اگلتے ہوئے یہ محسوس کئے بغیر اپنی موٹر ہانکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کا منحوس بھوت اُن کے اندر حلول کر گیا ہے اور متمدن دُنیا میں وہ ایک کریہہ منظر بن کر رہ گئے ہیں۔

اور دُنیا میں ایسے شوقین بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی دُکان پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اتنا شور مچاتے ہیں کہ بات کرنا تو درکنار راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے بھی ہیں جو اپنے مکان کی چھت پر ریڈیو یا گراموفون بجا کر لوگوں کے کانوں میں بردستی تنامنگیشکر اور ملکیش کے گانے ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ ہیزلٹ کہتا ہے، "جو شخص ستار سیکھنا چاہے اُسے چاہیئے کہ گھر کے اندر سیکھے اور پڑوسیوں کے لئے وبالِ جان نہ بنے۔ اس کا فرض ہے پڑوسیوں کے لئے کم سے کم تکلیف دہ بننے کی کوشش کرے۔ اگر ضرورت ہو تو کوٹھری کے اندر بند ہو کر مشق کرے، لیکن اپنے مکان کے صحن میں اس طرح مشق نہ کرے کہ لوگوں کے کان کے پردے پھٹ جائیں۔"

بعینہٖ یہی مثال گراموفون اور ریڈیو پر صادق آتی ہے۔ اگر آپ گراموفون رکھنا

چاہتے ہیں تو بے شک آپ کو اس کا حق ہے لیکن اگر آپ اس کی آواز کو اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر محدود نہیں کر سکتے تو آپ یقیناً پڑوسیوں کی آزادی میں مداخلت کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے پڑوسی اس وقت لتا اور رفیع کے گانے سننے کے موڈ میں نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت مغموم ہوں اور اُن کے لئے آپ کا یہ عمل اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا اُن کا آپ کے گھر میں بلا اجازت داخل ہو کر بغیر کہے سُنے کوئی چیز اُٹھا کر چمپت ہو جانا۔

ایسے موقعے بھی پیش آتے ہیں جب ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے ٹکراتی ہے اور سمجھوتہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ میرے ایک پرانے دوست سٹرک پر لاؤڈ اسپیکر پر گانا سُن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے پڑوس میں ایک نوجوان رہتا ہے جو لاؤڈ اسپیکر کی آواز سُن کر تڑپ اُٹھتا ہے اور اس کی طرف اس طرح جھپٹتا ہے جس طرح مکھی شیرے پر۔ اب بتایئے اس معاملہ میں کس کی آزادی کس کے مقابلہ میں جھکے۔ کم از کم میں اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ سٹرک پر لاؤڈ اسپیکر کا گانا ناپسند کرنا اتنا ہی جائز ہے جتنا اس کو ناپسند کرنا۔ کاش اس دلچسپ گتھی کو سلجھانے میں حضرت سینکو پانزا ہماری رہبری کر سکتے۔

میں سمجھتا ہوں اصل معاملہ یہ ہے کہ ہم اس رنگا رنگ دُنیا میں نہ مکمل طور پر "لاقانونیت" اختیار کر سکتے ہیں، اور نہ مکمل طور پر "اشتراکیت"۔ بلکہ ہمیں ان دونوں کا ایک خوش ذائقہ اور موثر مرکب بننے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی انفرادی

اور سماجی دونوں قسم کی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں چاہیئے جمہوریت اور اشتراکیت دونوں کا بغور مطالعہ کریں اور اس کے بعد رائے قایم کریں۔ میں ذاتی طور پر نہ پوری طرح مارکس کو مانتا ہوں اور نہ پوری طرح ٹالسٹائی کو۔ یوں سمجھئے جیسے میں دونوں کے بین بین کوئی چیز ہوں۔ اگر آپ مجھ پر زور دیں کہ میں اپنے بچہ کو فلاں اسکول میں بھیجنے کی بجائے فلاں اسکول میں بھیجوں، یا سائنس پڑھوانے کی بجائے آرٹ کی تعلیم دلواؤں، یا کرکٹ کھیلنے کے بجائے کبڈی کھیلنے پر مجبور کروں، تو یہ میں ہرگز برداشت نہ کروں گا۔ یہ باتیں ذاتی ہیں اور میں اس معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں جو چاہوں کروں۔ البتہ اگر میں یہ کہنے لگوں کہ میں اپنے بچہ کو سرے سے تعلیم ہی نہیں دلواؤں گا، یا ایسی تعلیم دلواؤں گا کہ میرا بچہ بڑا ہو کر وحشی بن جائے، یا سلطانہ ڈاکو کے گروہ میں داخل ہونے کی قابلیت پیدا کرے، تو سوسائٹی کو اختیار ہے وہ مجھے ہرگز اس کی اجازت نہ دے۔ سوسائٹی مجھ سے کہہ سکتی ہے کہ اسے وحشیوں اور ڈاکوؤں کی ضرورت نہیں۔ سوسائٹی مجھے اپنے بچہ کو مقررہ معیار تک تعلیم دلانے پر مجبور کر سکتی ہے چاہے میں اُسے پسند کروں یا نہ کروں۔ میں بہرحال اتنا آزاد ہرگز نہیں ہوں کہ پڑوسیوں کے لئے وبالِ جان بن جاؤں۔ اور اپنے بچے کو دوسروں پر بوجھ اور ملک کے لئے ایک خطرہ بنا دوں۔

دراصل ہم اپنے روزمرہ برتاؤ اور اخلاقی معیار سے اپنے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ہم کتنے متمدن ہیں۔ جرأت و ایثار کے مظاہروں کے اب بہت کم موقعے آتے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی عادتیں انسان کی زندگی کو سنوارتی اور سفرِ حیات کو شیریں یا تلخ بناتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے میرا دوست جس نے ریل میں میرے کان کھائے تھے اب ضرور اس مسئلہ پر فکر کرے گا۔ اس کے بعد مجھے یقین ہے وہ اپنے ساتھی کو یہ نہیں سمجھائے گا کہ پنڈت جی کو یہ کرنا چاہیئے یا وہ کرنا چاہیئے بلکہ وہ اس طرح پیش آئیگا کہ میں بھی اپنے مطالعہ کو جاری رکھ سکوں۔

غرارے

آخر کار غرارے سِل گئے ——————!

وہ بچپن سے تنگ پاجامہ پہنتی آئی تھی۔ لیکن غرارہ پہننے کو اس کا دل ترٹپتا تھا۔ ساری اور شلوار سے اُسے دلچسپی نہ تھی۔ آس پڑوس کی عورتیں جب غرارے پہن کر اس کے سامنے سے گذرتیں تو اُس کا دل چیخ اُٹھتا کاش کہ اس کے پاس بھی اتنا ہوتا کہ وہ غرارہ پہن سکتی!

وہ ایک غریب گھر کی بیٹی تھی اور ایک غریب گھر میں ہی بیاہی تھی۔ اس کے میاں بیچارے ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک پرائمری مدرسہ میں قصبہ سے کوئی بیس میل دور، ملازم تھے، جہاں وہ روزانہ صبح ۹ بجے کی گاڑی سے جاتے اور شام کی پہلی گاڑی سے لوٹ آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مستقل وہیں رہنے لگتے تھے۔ اُن بیچارے کو سب

ملا کر بیالیس ۴۲ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جو وہ ہر مہینہ لا کر بیوی کے ہاتھ میں دے دیا کرتے تھے ۔ بیالیس روپے اور وہاں آٹھ جانوں کے کھانے اور پہننے کا خرچ ! یہ ذرا سے پیسے اتنے بڑے کنبے میں بھلا کیا ٹکا کر سکتے تھے ۔

اس لئے منشی جی بیچارے نے آمدنی کے کئی اور طریقے ایجاد کر رکھے تھے ۔ مثلاً وہ ٹیوشن کے بہانے بچوں سے فی کس دو روپے ماہوار کے حساب سے وصول کیا کرتے تھے ۔ اُن کے درجہ میں تیس لڑکے بھی ہوتے تو اُن کی ماہانہ آمدنی ساٹھ روپے ہو جاتی تھی ۔ پھر کھیل کا چندہ قاعدہ میں ایک پیسہ ماہوار تھا لیکن وہ ہر بچہ سے ایک آنہ وصول کیا کرتے تھے ۔ ڈیڑھ دو روپے کی اس آمدنی سے وہ اپنے لڑکے کی فیس دیا کرتے تھے جو معاف ہونے پر بھی ڈیڑھ دو روپے ہوتی تھی ۔ اس کے علاوہ امتحان کا زمانہ گویا اُن کی عضب کا زمانہ ہوتا تھا ۔ امتحان کے موقعہ پر فی لڑکا کم از کم پانچ روپے وصول کرتے تھے ، اور جس نے نہ دیا وہی فیل ! موٹی آسامیوں سے دس اور پندرہ تک بھی نہ چھوڑتے تھے ۔ یہ اُن کی "مٹھائی" کے پیسے ہوتے تھے ، اور اُن کے نزدیک بالکل جائز تھے ۔ اُن کا خیال تھا جب سرکار لازمی تعلیم کے ذریعہ مفت تعلیم دینے کا انتظام کرتی ہے تو وہ اپنا حق کیوں چھوڑیں اور کھاتے پیتے لوگوں سے کیوں پیسے وصول نہ کریں ۔ گیہوؤں کے ساتھ ایک آدھ گھن بھی پس جاتے تو مجبوری ـــــ !

ماہانہ تنخواہ کے بیالیس روپیوں میں مہنگائی بھتہ بھی شامل تھا جو صرف

بارہ روپے تھا۔ اس کے برخلاف چپراسیوں کو مہنگائی کے بیس روپے ملتے تھے۔ اس حساب سے چپراسی کی تنخواہ ایک مدرس سے صرف دو روپے کم تھی، اور بعض پرانے چپراسی نئے مدرسین سے زیادہ تنخواہیں بھی پا رہے تھے —— اُن مدرسین سے جن کے کاندھوں پر "قوم" کے بنانے اور بگاڑنے کا بھاری بوجھ رکھا ہُوا ہے، جن پر بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہم ذمّہ داری ہے —— اُن بچوں کی جو بڑے ہو کر ملک و قوم کے رہنما بننے والے ہیں۔ اس مہنگائی کے زمانہ میں مُدرسین کی تنخواہ اتنی مختصر اور مہنگائی بھتّہ چپراسیوں سے بھی کم —— غضب خدا کا —— !!

چپراسیوں کے مقابلہ میں مہنگائی بھتّہ میں اکٹھے آٹھ روپے کی کمی کو عملہ کے تمام مدرسین بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ "ادھیاپک سبھا" کے جگہ جگہ جلسے ہوئے، اور مُدرسین نے اپنی اس جائز مانگ کو سرکار کے سامنے رکھا۔ مگر اُن کی درخواستیں نقار خانہ میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئیں۔ ہڑتال کے بارے میں وہ سوچتے تھے، پر اس کے لئے ہمّت نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ راستہ انتہائی خطرناک تھا، خاصکر اس بے روزگاری کے زمانے میں جب کہ ڈھیلے کے لئے ہاتھ بڑھاؤ تو مُدرّس ہاتھ لگتا ہے۔ اس لئے بیچارے تھوڑی بہت چیخ پکار کرنے، رونے پیٹنے، اور اس کے بعد چپکے ہو رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن ایک دن اسکول پہنچ کر منشی جی کو معلوم ہُوا کہ سرکار مہنگائی بھتّہ میں اضافہ کے سوال پر غور کر رہی ہے اور یہ کہ یہ بھتّہ اُنھیں بہت جلد مل جائے گا اور گذشتہ اپریل ۱۹۴۹ء سے ملے گا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہر مدرس کو لگ بھگ تین سو

روپے یک مشت ملنے کی اُمید ہو گئی۔

گھر لوٹے تو یہ خبر سب سے پہلے بیوی کو سنائی۔ بیوی تین سو روپے کا نام سُن کر اُچھل پڑی۔ دراصل ایسی ہی "چھپر پھاڑ" قسم کی رقم سے اُس کے غزاروں کی اُمید وابستہ تھی۔ اور ایک غزارے ہی کیا، روپے ملنے کی خبر سُن کر اس کے دماغ نے اس رقم کو خرچ کرنے کے متعلق سینکڑوں اسکیمیں بنا ڈالیں۔

اب وہ اپنے اور اپنی بچی کے لئے، جس کی عمر سات آٹھ سال تھی، سونے کے بُندے بنوائے گی۔ کیونکہ آس پڑوس میں ایک بھی تو ایسی نہ تھی جو سونے میں پیلی نہ رہتی ہو۔ پھر وہ بے بُندوں کے کیسے رہ سکتی تھی۔ خاصکر ان حالات میں کہ اس کے پاس ایک بڑی رقم آنے والی تھی۔ اس کے علاوہ اس کو روزمرّہ کے خرچ کی چیزوں مثلاً بناسپتی گھی، ایندھن، مسالے وغیرہ کا اسٹاک خرید کر رکھ لینا تھا تاکہ وقت بے وقت ضرورت پڑنے پر دوسروں سے بھیک نہ مانگنی پڑے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اُسے اپنے لئے میاں سے سونے کے کڑوں کی فرمائش کرنی تھی۔ کیوں نہ پہنے وہ کڑے آخر! اُس کی ایک پڑوسن جس کا میاں صرف تیس روپیہ ماہوار کا پٹواری تھا سونے میں لدی پڑی تھی۔ اور اس کے میاں کو تو پورے بیالیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اس ملنے والی رقم کی موہوم اُمیدیں، اس نے سیکڑوں ہوائی قلعے تیار کر ڈالے۔

اس کے ساتھ وہ اتنی دور اندیش بھی تھی کہ اس نے یہ بھی طے کیا کہ اس رقم کو

جز رسی سے خرچ کرے۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ اس میں سے کم از کم سو روپے وہ جمع کر رکھے گی جو اس کے آڑے وقت میں کام آئیں گے۔ بنک وغیرہ میں جمع کرنے کا سوال اس لئے نہیں تھا کہ وہ گھر میں بیٹھنے والی عورت ذات بھلا ضرورت کے وقت کہاں دوڑی دوڑی پھرے گی! البتہ کسی پڑوسن کے پاس امانت میں رکھے جا سکتے تھے لیکن اس میں بھی خطرہ تھا۔ روپیہ کا معاملہ! کوئی مکر جائے! ۔۔۔۔ کیا ہو کیا نہ ہو! اس بیچاری کے پاس کوئی الماری بھی نہ تھی جس میں وہ اس رقم کو محفوظ کر سکتی۔ ایک الماری تھی تو اس کے کواڑ نہ تھے اور اس معاملہ میں کواڑوں کے سلسلہ میں میاں سے کچھ مانگنا اُن سے ایک مستقل جنگ مول لینے کے برابر تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی صندوقچی ضرور تھی۔ جس میں روپے رکھے جا سکتے تھے، لیکن اُسے چور بہ آسانی کسی وقت بھی اُٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ یا تو کسی ناج واج کی مٹکی میں روپے رکھے جائیں، یا اُپلوں کے ڈھیر میں چھپا دیئے جائیں، یا کسی ہانڈی میں بند کر کے زمین میں دفن کر دیئے جائیں۔

جب سے اس نے تین سو روپے کا ذکر سُنا تھا وہ چوروں سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتی تھی جس میں صرف ایک کوٹھری تھی اور وہ بھی شکستہ حالت میں تھی۔ جب بارش ہوتی تھی تو اُسی کوٹھری میں وہ کھانا پکانا کرتی تھی۔ اُس کے مکان کا دروازہ کبھی کا گر چکا تھا۔ گتے بلی کی روک تھام کے لئے اُس نے ٹاٹ کا ایک پردہ لگا رکھا تھا جو معمولی بارش اور ہوا کی تاب نہ لا سکتا تھا۔

اُس کے گھر میں دیسی تیل کا دیا جلتا تھا اور کبھی کبھی اسے اندھیرے گُپ میں رات بسر کرنی ہوتی تھی۔ اگرچہ اُس کے گھر میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جسے حاصل کرنے کے خیال سے چور اس کے گھر میں آنے کی زحمت کرتا۔ پھر بھی چور کے تصور سے اُس کی رُوح کانپتی تھی، اور وہ اس خوف میں جب کبھی اس کے میاں باہر ہوتے اپنے بچوں کو لیکر پڑوس میں جا پڑتی تھی۔

وہ یہ منصوبہ بناتی رہی اور روپئے —— !

مہینے گزر گئے اور روپے نہ ملے۔

"کب تک ملیں گے یہ روپئے نگوڑے"؟ اس نے گھُٹ کر ایک دن میاں سے پوچھا۔

"مل جائیں گے!"

"کب مل جائیں گے؟ کوئی حد بھی ہے!"

"بس دو چار دن میں!" میاں نے اطمینان دلایا۔

"دو چار دن! دو چار دن! جب پوچھو دو چار دن! دو چار دن بھی سنتے سنتے چھ مہینے ہو گئے۔ اگر نہیں دینے تو سرکار صاف کیوں نہیں کہتی کہ ہم بھی تمہاری طرح بھوکے ننگے ہیں۔ سارے گاؤں تے اسکول کھول کھول کر لوگوں کو نوکر کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ آگ لگے ایسی سرکار کو!" وہ گرجتی رہی اور میاں چُپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔

وہ کیا سمجھاتا اپنی ناسمجھ اور جاہل بیوی کو کہ سرکار سے تین سو روپے ملتے ہیں

کتنی دیر لگتی ہے۔ کس طرح سرکار بجٹ میں روپیہ رکھتی ہے، کیونکر اکاؤنٹنٹ جنرل کے ہاں اس کی منظوری بھیجی جاتی ہے اور اس میں کتنے دن لگتے ہیں۔ پھر کس طرح کاغذات کمشنر اور کلکٹر کے یہاں ہوتے ہوئے ضلع بورڈ تک پہنچتے ہیں۔ بورڈ میں آنے پر بورڈ کی منظوری میں بھی کئی کئی دن لگ جاتے ہیں اور کبھی کبھی کئی کئی ہفتے۔ پھر کتنی دشواری سے بورڈ کا اکاؤنٹنٹ ہر مدرس سے پانچ فی صدی لینے کے بعد قبض الوصول تیار کرتا ہے۔

پھر جب روپیہ بورڈ کے خزانہ میں آجاتا ہے تو خزانچی پانچ فی صدی اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے تب کہیں روپیہ اسامی تک پہنچتا ہے۔ پھر اس تمام کارروائی کو اتنے دن نہ لگیں تو کام کیسے چلے۔ اس بھید بھاؤ کو اس کی جاہل بیوی بھلا کیا سمجھ سکتی تھی۔ اُسے اپنی بیوی کے کوسنے جو اُس نے اپنی جہالت اور ناسمجھی کے باعث سرکار پر صرف کئے تھے، بُرے لگے۔ اُس کے خیال میں مدرسین کے ساتھ سرکار کی یہ انتہائی رعایت تھی کہ وہ مدرسین کے مہنگائی بھتہ میں اکٹھے آٹھ روپے کا اضافہ کرنے کے لئے تیار تھی۔ اُس کے نزدیک سرکار سے زیادہ رحم دل اور انصاف پسند کوئی بھی نہ تھا اور اس نے یکبارگی بیوی کو ڈانٹا۔

"اپنی بکواس بند کرو۔ تم کیا سمجھو ان باتوں کو۔ روٹی ڈالو ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

آخر کار تین سو روپے ملنے کی شبھ گھڑی بھی آ گئی۔ مہینہ کی پہلی تاریخ تھی۔ شام کو میاں لوٹے تو خلافِ معمول اُن کے ساتھ ایک جوڑ بندے اور ایک عدد چھتری بھی

تھی۔ چھتری سے مُراد وہ بارش کی چھتری نہیں جسے لگا کر ہر شریف آدمی فیشن کے ساتھ بھیگنے میں فخر سمجھتا ہے بلکہ وہ لمبی چوڑی چھتری جو دوسری جنگِ عظیم کی باقیات الصالحات میں سے ہے اور جسے جنگی زبان میں "پیراشوٹ" کہتے ہیں۔ یہ چھتریاں کباڑی لوگ نیلام میں کوڑیوں کے مول خرید کر خاصے نفع کے ساتھ بیچتے ہیں اور لوگ دیگر کپڑے کے مقابلہ میں سستا سمجھ کر اُنھیں ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن میں سے پورے ایک کُنبے کے پہننے کا کپڑا نکل آتا ہے۔ بُندے اور چھتری آنے کے بعد تین سو روپے مِل جانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی۔

تین سو روپے اُس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ ٹھیک طرح یہ بھی نہ جانتی تھی کہ تین سو روپے کتنے ہوتے ہیں۔ اُس کے نزدیک تین سو روپے کے معنی بہت سے روپیوں کے تھے اور بس! یا تین سو روپیوں کی وہ قیمت تھی جو ہمارے اور آپ کے خیال میں ڈالمیا اور برلا کے کارخانوں کی ہے۔

اب اُسے روز روز کے یہ دھکے ٹکے نہ کھانے پڑیں گے، اُس نے سوچنا شروع کیا، اب اُسے آئے دن پڑوسنوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اب وہ اپنا اور اپنے بچّوں کا آسودگی کے ساتھ پیٹ پال سکے گی۔ اب اُسے چکی پیسنے کی مصیبت سے بھی نجات مِل جائے گی جس کے باعث گرمی میں وہ پسینہ میں نہا جایا کرتی تھی۔ اب وہ روزانہ رات کو مٹی کے تیل کا لمپ جلایا کرے گی۔ اب وہ اپنے اور بچّوں کے لئے دل کھول کر کپڑے بھی بنائے گی۔ اب جبکہ گھر میں کافی کپڑا موجود تھا

غراروں کی بات بھی پکی تھی۔ اور وہ سونے کے بُندے اور غرارے پہننے کے تصوّر سے جھوم اٹھی۔

رات کو نیند اُسے مشکل سے آئی۔ اور جب سوئی تو خواب میں بھی غرارے نظر آئے۔ صبح سویرے آنکھ کھل گئی اور وہ بچہ کو سوتا چھوڑ، بُندے اور کپڑا بغل میں دبا، پڑوسن کے ہاں جا دھمکی۔

"لو یہ رہے بُندے اور یہ رہا کپڑا!" اُس نے بڑے فخریہ انداز میں پڑوسن کو جتایا۔ "تم کہتی تھیں بڑے آئے بھی تیرے پاس بُندے! اب دیکھ لو یہ سونے ہی کے ہیں یا کسی اور چیز کے! —— اور کپڑا —— ! ڈھیر کپڑا آ گیا بوا! میرا تو ہاتھ بھی ٹوٹ گیا لاتے ہیں۔ میں کیا کروں گی اتنے بہت سے کپڑے کا! میں تو غرارے بناؤں گی اپنے لئے! کیوں بوا؟ نہیں تو سب بچ کر جائے گا!"

پڑوسن بُندے دیکھ کر پہلے مسکرائیں پھر بڑے سرپرستانہ انداز میں اسے سمجھانے لگیں:۔

"باؤلی کہیں کی تیری عمر غرارے پہننے کی رہ گئی ہے! ——"

"واہ بوا واہ! عمر کی خوب کہی! ہمارے پاس جو دیوان جی کی بیوی رہتی ہیں وہ تو مجھ سے بھی بڑی ہیں اور وہ غرارے پہنتی ہیں۔ ان کو نہیں کہتیں اُن میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے جو مجھ میں نہیں ہے!"

پڑوسن اُس کے اس بے تکے جواب پر بگڑ گئیں اور انھوں نے ذرا تیز لہجہ

میں کہا :-

" پھر مجھ سے کیوں صلاح لینے آئی تھی ؟ تو جان تیرا کام جانے ، مجھے کیا غرض ! میں تو تیری بھلائی کے لئے کہتی تھی ۔ جتنے کپڑے میں غرارے دو بنیں گے اتنے میں پاجامے چار بنیں گے ، جو تو سال بھر پہنے گی ۔"

" اجی بس بہن حلق تنگ ہا ! " اُس نے دماغ پر چوٹ دیئے بغیر جواب دیا ۔ " تنگ پاجامے پہنتے پہنتے جی اُکتا گیا ! ان سے تو ٹانگیں چھلتی ہیں بوا ! اور کیا میری قسمت کے تنگ ہی رہ گئے ہیں ؟ میرے دل نہیں ؟ میں اپنی حسرت نہ نکالوں ! جب مجھے اللہ نے پیسہ دیا ہے تو میں اُس کی ناشکری کروں ۔ وہ کہتے تھے ، میں کپڑا لا دوں تو کیا ، تم سے پہننا ہی نہ آئے گا ، تو بوا مجھے اُنھیں بھی اب کے یہ دکھا دینا ہے کہ مجھے پہننا آتا ہے اور غرارے مجھ پر کیسے کھلتے ہیں ! "

پھر اُس نے پڑوسن کو روپے ملنے کا راز بتایا اور اخراجات سے متعلق اپنی تمام اسکیمیں سنا ڈالیں جس پر پڑوسن اور اُن کی بہو بیٹیوں نے مل کر اس کا خوب مذاق اُڑایا ۔ پھر اُس نے غرارے سینے کے لئے اُن کی خوشامد کی ، بڑے نخروں سے وہ غرارے سینے کے لئے راضی ہوئیں ۔

آخر کار غرارے سِل گئے ———— !

لیکن جب میاں نے بیوی کے ہاتھ میں تنخواہ دی اور خلافِ معمول اُس میں دس روپے کم نکلے ———— تو ————

اڑاڑاڑا دھم!!! اس کے تمام ہوائی قلعے ایکا ایکی مسمار ہو گئے ——————!

اور اگلے دن —————— مجبوراً ——————

غرارے تنگ پاجاموں میں تبدیل کرا لئے گئے۔

ختم شد